تمام حقوق بحق پبلک بک ایجنسی لاہور محفوظ ہیں

حیاتِ تسلیم

یعنی

ہمپایۂ قدسی و کلیم منشی مولوی شیخ امیر اللہ صاحب تسلیم
لکھنوی کی سوانح عمری

مصنفہ

منشی ضمیر الدین احمد صاحب عرش تعلقدار و رئیس گیا
و مصنف ناول ثمرۂ نافرمانی و رسالہ عروض و قوافیہ وغیرہ

جس کو

منشی محمد الدین صاحب فوق مالک و منیجر
پبلک بک ایجنسی لاہور نے باخذ حقوق تصنیف
اپنے اہتمام و انصرام سے
غرۂ [illegible] ہند پر چھپوایا

قیمت ۲ر

Rare
811.309
168 [D]

تصویر شاعر بے نظیر یگانہ

قدسی و کلیم منشی شیخ امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی

مخمس

سرود اشعار ملک الشعرا اوستاذ تسلیم کہ برائے درج حیات تسلیم پائے ہین

از حقیر عرش تلمیذ تسلیم مدظلہ و مصنف حیات تسلیم

گرچہ ہون رشک صبا اور وزیر — ہند مین آپ ہون مین اپنی نظیر
ہے اسی طرح جو اپنی تقدیر — ہو چکی حشر مین اس کی توقیر
زندگی مین نہ ہوئی جب تعظیم

حالتین عرش نے کین گرچہ رقم — قدردان ہی نہ رہے وائے ستم
مجھ مین تسلیم کہان وہ دم خم — دونون عالم مین ہین یکسان ہم
مرگ تسلیم و حیات تسلیم

آہ

صبح ہو گئی ہے۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ رات جو لوگ اپنے نغمۂ کلام سے دل خوش کر رہے تھے اس وقت نظر نہیں آتے صرف ایک شمع رہ گئی ہے وہ بھی خدا جانے کس خیال میں زار زار رو رہی ہے۔ نسیم سحر کے جھونکے اوسے چھیڑتے ہیں اور وہ چپکے سے جھلملا کر رہ جاتی ہے۔ اور کوئی اس بزم میں ایسا نہیں جس سے کچھ اگلی صحبتوں اور قدیم بزرگوں کا پتہ ملے مگر وہ کارروان کی طرح یہی ایک شمع رہ گئی ہے وہ بھی اپنے حال میں مبتلا ہے۔ نہ میری سنتی ہے نہ اپنی کہتی ہے۔ رات کے بچے ہوئے وہ پگلستان نظم کے کچھ خوش رنگ پھول پڑے ہیں جس سے کمال کی خوشبو آتی ہے مگر افسوس کہ وہ باسی ہیں پھر کیف میں گلچین باغ نظم ہوں اوسے چنکر دامن ارزو بھر لینا اپنا فخر جانتا ہوں کہ اگلے اساتذہ کے فیض سے بھی محروم نہ رہوں۔

میرے دوستو یہ وہی بزم ہے جہاں رات سودا و درد نسیم دہلوی و مومن خاں شیخ غزل سرائی کر رہے تھے۔ اور اس وقت اون کی یادگاروں میں حضرت اوستاذی ملک الشعرا شیخ امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی شمع صفت اس دور کے ذکیلئے سیلئے جراتوں کی وضع اور اکڑ دیکھ کر چپ ہیں مدت سے میرا ارادہ تھا کہ اس یادگار سودا و درد کی سوانح عمری لکھ کر قدردان اہل کمال سے محنت کی داد لوں کہ میرا نام سعادتمند شاگردوں میں صفحۂ ہستی پر درج ہو کر یادگار رہے۔ مگر کل امور کے لئے اوقات مقررہ کا انتظار ضرور ہے۔ دوسرے زمانہ کے تفکرات نے جینے جی مار ڈالا اور اگلے تاجر کہ مصنفوں کے قدردان تھے وہ بھی اوٹھ گئے اونکے کارخانے درہم برہم ہو گئے اہل کمال کی قلمی کتابیں عطاروں کی پڑیا باندھنے کی غرض

سے پاتا ہوں۔ مدت کے بعد باغ تمنائی میں بہار آئی جناب منشی محمد الدین صاحب
فوق اڈیٹر اخبار پنجۂ فولاد نے کہ میرے قابل دوست اور قدردان ہیں حیات تسلیم
کی قدردانی کی۔ خدا سلامت رکھے۔ اسوقت لاہور عجب مقام ہے اور کیوں نہ ہو کہ
یہاں کی فرش زمین پر بڑے بڑے اہل کمال بیٹھے ہیں۔ اے لاہور تیری خوش قسمتی
پر رشک یاد آتی ہے

ہائے افسوس جسوقت یہ تذکرہ مرتب ہوا تھا۔ مکرمی منشی امیر احمد امیر مینائی
اور میر خورشید علی نفیس لکھنوی زندہ تھے۔ آج نگاہیں ہر طرف دوڑا کر انکو دیکھتا
ہوں مگر پتا نہیں ملتا۔ کل کی باتیں کہانیاں ہوگئیں ؎ عرش

زندہ جو کل تھے آج اونہیں کا فسانہ ہے
کس کس کو روئیے یہی رنگ زمانہ ہے

بندہ عرش کفش بردار اوستاد تسلیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس آفتاب چہر نظم کی روشنی ایوان معانی میں مدت سے پھیلی ہوئی ہے جہاں شہرت کا ہر ذرہ اختر پُر نور کی طرح فیض کرم سے روشن ہے اور اسکی روشنی کی اہل نظر کی آنکھوں میں جگہ ہے اوسکے آگے اور سخندانوں کا چراغ قطرہ شبنم کی طرح فنا کا دم بھر رہا ہے۔

یہ اوس باغ سخن کا گل سرسبز ہے جسکے نظیر سودا اور درد دہلوی تھے۔ یہ وہ آئینہ ہے جسکی نمود سے باغ عالم میں آجتک نسیم دہلوی کا طوطی کلام زمزمہ پرداز ہے۔ اس کا کلام باغ مقبولیت کا وہ پھول ہے جسکو گلاب کی طرح ہر باغ اور گلدستوں کی طرح ہر محفل میں پاتا ہوں۔

یہ زمین کمال کا وہ بحر ناپیدا کنار ہے جس سے لاکھوں جوہر تشنہ کام سیراب ہوئے سینکڑوں قطرہ دریا ہوگئے ہزاروں جنگل سرسبز ہوگئے اور خشک نہیں آجتک اس بحر کا ہر قطرہ دفور دریا دلی سے جام آسمان کو لبریز کرنیکی ہمت رکھتا ہے اللہ رے ظرف دماغ۔

اس شہنشاہ ملک سخن کے سریر علم معانی کا وہ مرصع تاج ہے جس میں گوہر فصاحت والماس بلاغت ستاروں سے زیادہ درخشاں ہیں ان جواہرات کے پرکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس تاج کا ہر گوہر بے بہا ہفت اقلیم اور چرخ ہفتم ستاروں سے بھی زیادہ قیمتی ہے ہاں جواہر پاروں کے قدردان چل بسے۔

جب یہ بادشاہ کمال عالم ارواح سے سیر کشور اجسام کرتا ہوا جہان نظم کی طرف چلا تو مکان قدرت کے دروں سے اسلاف کے نفیس پردے اوٹھ گئے لوح نوشتہ تقدیر بدی چیزوں کی طرح ساکنان فلک اور اہل قمر آشکارا ہوگئے فرشتوں نے تاج مبارک پہنا کر کہا کہ تو شہنشاہ اقلیم سخن ہے تجھ پر اب دہلی کی قدیم شاعری ختم ہوگئی تیرے قدردان بھی بادشاہی ہوگئے۔ لکھنؤ کے بزم سخن کا تخت تجھے نصیب ہوگا۔ سچ ہے۔ آخر وہی ہوا۔ اس وقت لکھنؤ اور دہلی کے اساتذہ آپ ہی کو مستند فرماتے ہیں اور کہنہ مشق کہتے ہیں نسیم

تسلیم باغ دہر میں فیض نسیم ہے کہتی ہے خلق بلبل ہندوستان مجھے

اب زمانہ اور ناقدردانی کیوجہ سے ہرگز امید نہیں کہ پھر ایسا قادر
اوستاد دنیا میں پیدا ہو اور یہ عزت حاصل کرے کہ اوستاد تک اوستاد مانیں۔
ہرچند کہ ہٹ دھرموں کے منہ میں زبان ہے بھی یہی فرمائینگے کہ شاگرد نے بہت
بڑا دیا۔ مگر انصاف کی عینک سے اگر اس سچے تذکرے کو دیکھیں گے تو مصنف
آبحیات کی طرح مجھے بدنام نہ کرینگے غریب ہمدرد آزاد دہلوی بھی بدنام ہے۔
اور وہ صرف اس وجہ سے کہ اوستاد کی اتنی تعریف کی۔

نام اور حالت وطن

آپکا اسم گرامی احمد حسین اور عرف ابو احمد ہے۔ عرف مشہور عالم ہے تخلص
آپکا تسلیم ہے آپکے والد مرحوم کا اسم گرامی مولوی عبد الصمد تھا۔ آپکے آبا اجداد کا
اصلی وطن قصبہ بدیع السرا عرف بدو سرائے مضافات دریا آباد ہے۔ مگر قصبہ
مذکور چھوڑ کر فیض آباد اودھ میں مقیم تھے۔

وطن چھوڑنیکی وجہ

اے نئی روشنی والے نوجوانو عینک لگی ہوئی آنکھوں سے ادھر دیکھو۔
اگلے بزرگ لوگ حتی المقدور نہیں پسند کرتے تھے اپنے نسب نامہ کو الٹ
کر دس بیس پشت کے لوگوں کی حالتوں کو دیکھو انہیں تمہاری طرح ملازمت پر
فخر نہ تھا زراعت سے انہیں دلچسپی تھی بڑے بڑے کھیتوں کی سیر پسند تھی
آپکے والد مولوی عبد الصمد صاحب مغفور زمینداروں کی مال فیاضی کیا
کرتے تھے اور وہی معاش کا ذریعہ تھا اور دو گاؤں حسن پور اور بہاڑپور بزرگوں
کی یادگار بطور زمینداری کے بھی تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق وقت کہ روپیہ وصول
نہ ہوا گیارہ ہزار روپیہ باقی رہ گیا ناظم دریا آباد نے سخت طلبی کی یہاں تک کہ
آپکے والد اور بڑے بھائی منشی عبد اللطیف صاحب دونوں قید ہوئے اور
ناظم نے ہر طرح کی تکلیف دینی شروع کی آپکے دادا صاحب زندہ تھے۔
اون کو تاب نہ آئی اور اولاد کی یہ تکلیف دیکھی نہ گئی جسقدر سرمایہ گھر میں موجود

شاہ صاحب کی اور یہ دونوں گاؤں رام سنگھ قوم چندیل کے پاس گرو رکھ کر آپکے والد، دو بڑے بھائی کو قید سے چھڑایا اور روپیہ ادا کر دیا۔ رعیت چونکہ اپنے مرہونہ گاؤں میں رہنا گوارا نہ کیا اس لئے آپکے بزرگ فیض آباد اودھ میں آکر آباد ہوئے مگر وہاں بھی گردش ایام کا چتر سر پر پھرتا رہا آپ والد نے مستقل طور پر رہنے دیا فکری کی فکر نے دائرہ لکھنؤ میں لاکر صورت پکا پھرایا۔ آخر یہاں آپکے والد صفدری نام ایک پلٹن میں اوشدار ہوئے (اوشداری ایک عہدہ کا نام تھا کہ پانچسو آدمی کا افسر ہوتا تھا) تیس روپیہ ماہوار آپکے والد کو ملا کرتے تھے۔ جب آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو اوسی پلٹن میں سفارش وغیرہ سے چہرہ ہو گیا نوکری وغیرہ نہیں کرنی پڑتی تھی مگر پانچ روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ مختصر یہ کہ لکھنؤ ہی کو آپکے وطن ہونے پر فخر ہے

حالت تعلیم

آپ نے فارسی کی کتابیں اپنے والد اور مولوی شہاب الدین صاحب مغفور شاگرد میرزا ناطق گرانی سے اور عربی کی کتابیں اپنے بڑے بھائی سے کہ علامہ دہر فاضل جلیل القدر مولوی ولی اللہ صاحب مغفور کے شاگرد تھے پڑھیں (یہ وہی مولوی ولی اللہ صاحب ہیں جنکے انتقال کی تاریخ کلیات تسلیم میں یوں مندرج ہے)

قطعہ تاریخ وفات حقیقت آگاہ معرفت دستگاہ حضرت شاہ ولی اللہ بھڑائچی قدس سرہ

آہ جب حضرت ولی اللہ شاہ بھر سیر روضۂ رضوان چلے
خامہ تسلیم نے لکھا یہ سال ۔ بادشاہ کشور عرفاں چلے

۱۲۸۳ھ

اکثر آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تمہارے اوستاد مولانا محمد عبد الاحد صاحب شہید فرنگی محل لکھنؤ کے بزرگوں کے فیض سے ہے چار حرف آتے ہیں

حضرت نشاد کو میں باوجود سنی ہونے کے مکرم جانتا ہوں وہ ماہر فن اور عالم اقدس ہیں (یا ہیچمدان عرش کے پاس اس مضمون کے اکثر سرفراز نامے بھی موجود ہیں)

آپ خوشنویس بھی ہیں اور اس فن میں آپ کو منشی عبدالحی صاحب سنسندیلوی سے کہ آپکے والد کے بڑے دوست تھے تلمذ حاصل ہے۔ چنانچہ کلیات تسلیم آپکے قلم سے لکھا ہوا مطبوع ہوکر صفحہ ہستی پر یادگار ہے (صفحہ ۲۰۰ کلیات تسلیم) میں ہمارے مکرم منشی قدر اعلی صاحب عیش مرحوم لکھنوی کہ کہنہ سال مشاق تھے تقریظ میں لکھتے ہیں کہ (بہ تصحیح تمام و تنقیح مالا کلام بخط خاص مصنف علام طبع ہوکر مطبوع طبائع مشاق انام و پسندیدہ کافہ خاص و عام ہوا) اے سبحان اللہ کیسا پختہ خوشخط حرف ہے۔

فن شاعری میں آپ نواب میرزا محمد اصغر علیخاں نسیم دہلوی شاگرد رشید مومن خاں دہلوی کے شاگرد رشید ہیں (یہ وہی مومن خاں ہیں جنکی ہمعصری پر غالب مرحوم کو فخر تھا یہی دو اوستاد اپنے رنگ میں آجتک یگانہ تسلیم کئے جاتے ہیں) اور آپ سے تلمذ کا ایک خاص سبب ہوا وہ یہ کہ آپکے بڑے بھائی منشی عبداللطیف صاحب حضرت نسیم دہلوی کے بڑے دوست تھے۔ حضرت اوستاد مدظلہ علم عروض و قوافیہ میں یگانہ روزگار ہیں ہندوستان میں دوہم ہے۔ بارہا ہیچمدان کہ لاینحل سینکڑوں بات کی بات میں سرے کی طرح آپ نے حل کردی۔

نئی روشنی والے دوستو! اگلے لوگوں کی محبت اور حالت ہی اور تھی پختہ وضع لوگ تھے۔ اونکا کیا کہنا۔ حضرت اوستاد اوسی گئے ہوئے قافلہ کی یادگار ہیں۔ دیکھو شاگردی کے مدعی کسقدر اگلے ارتباط کی پابندی کی اب تو وہ زمانہ ہے کہ کسی کی دوستی اعتبار کے لائق نہیں اور اگر کئے تو آجکل کے انگریزی دوستوں کا شمار تاروں سے زیادہ ہے ایک شیشی لیمنڈر اور ایک بکس سیگار میز پر رکھ لیجئے اور تماشا دیکھئے۔ اب وہ سچی محبت کہاں۔ اگر غور سے دیکھو تو اس اندھیری دنیا میں یہی ایک شمع اخر ہے۔ جسکی روشنی جہان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ورنہ وہ زمانہ وہ لوگ

[illegible] ہیں کہ زبان سنوار کر ہے بھی اوکی [illegible]
[illegible] سکوں۔ آجکے شعرا اور آجکل کی کیفیتوں کے ہلنوں کے جنہم اس قابل ہیں جو حضرت
تسلیم مدظلہ کے شاعری کے رنگ کو سمجھ سکیں۔ ہائے غالب خدا جانے کیا کچھ گیا
ع اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

سلسلۂ شاعری کا حال

میں نے رہے ہے اگلے بزرگوں سے پوچھا اور تذکرہ آبحیات دیکھا۔ مصنف آبحیات کی تحقیق میرے خیال میں ضرور اعتبار کے لائق ہے۔ حضرت اوستاد کی شاعری کا سلسلہ سودا۔ اور درد دہلوی سے ملتا ہے اور وہ یوں کہ حضرت تسلیم لکھنوی نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں اور نسیم مومن خاں صاحب کے شاگرد اور مومن شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے اور نصیر شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے اور مائل شاگرد قیام الدین قائم مرحوم کے تھے۔ اور قائم میری طرح دو اوستادوں کے شاگرد ہوئے یعنی سودا اور درد دہلوی سے مشورت لی۔ اس تحقیق میں حقیر کا بہت بڑا وقت صرف ہوا حضرت تسلیم مدظلہ سے بھی اسکی تحقیق کی اوستاد نے فرمایا کہ اسکی تحقیق کامل طور پر تو مجھے نہیں ہے مگر کسی قدر ہے مصنف آبحیات کا بیان قابل اعتبار ہے اے جان اللہ اور تو والا درجہ خدا دنیا میں ہو اور یہ اون کی یادگار ہیں سردست لکھنؤ میں یوں تو اکثر شاگرد حضرت نسیم دہلوی کے ہیں مگر یہ شہرت اور مقبولیت عام کا تمغہ کسی کو نصیب نہیں لکھنؤ تو لکھنؤ دہلی کو اگر آپ کی ذات پر فخر ہے تو بیجا نہیں کیونکہ دہلی کی مردہ شاعری اور وہاں کے بزرگوں کا نام اسی پیغمبر آخر زمان نظم سے دنیا میں قائم ہے۔

پیچھے ان ۱۳۱۱ھ میں بنارس ہوتا ہوا لکھنؤ گیا وہاں۔ مکرمی میر خورشید علی نفیس چراغ خاندان انیس زندہ تھے ملے دیر تک ادھر ادھر کا تذکرہ رہا۔ اس کہنہ سال نے بھی حضرت اوستاد تسلیم کا نام بڑے اعزاز سے اپنی زبان پر لاکر یہی کہا کہ لکھنے شعرا کو جانے دیجئے یادگار سلف اور مستند ہیں تو یہی ہیں اور غزل گوئی اردو کی انہیں سے قائم ہے جن آنکھوں میں اس

وقت یعنی غم کی پہلی نظر پر پھر رہی ہے آنسو بھی ہیں۔ گلوں میں مطمئن ہیں

آپکی اولاد کیحالت

چراغ تلے اندھیرا۔ کیا کہوں۔ خدا جانے یہ کس دل جلے کا قول ہے۔ میں نے حضرت اوستاد سے پوچھا کہ اپنے صاحبزادہ کی حالت کہئے۔ آپ نے ایک آہ سرد کھینچکر جو کچھ فرمایا بعینہ لکھتا ہوں (اس سے اون کے قیام کی حالت بھی ظاہر ہوگی)

میرا ایک لڑکا تجمل حسین نام پہلی بی بی سے ہے وہ لکھنؤ میں رہتا ہے شادی بیاہ کی آواز کی طرح میں ہے حافظ قرآن تھا سو قرآن بھلا دیا۔ استعداد علمی بہت کم ہے خط صاف ہے چھاپہ خانہ میں کچھ دس بارہ روپیہ کی کتابت کر لیتا ہے۔ اور سات روپیہ ماہوار میں دیتا ہوں۔ مکان میں رہتا ہے شاعری سے اوس کو کچھ بحث نہیں کہنے کو اوس کا یہ پتہ ہے (شہر لکھنؤ محلہ محمود نگر قریب مقبرہ اسد علی شاہ)

ع اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

اس دلخراش تقریر نے آنکھوں سے آنسو جاری کر دئے آسمان کی طرف دیکھ کر خوض میں بیٹھا ہوں۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفان کئے ہوئے

ہائے ایسا اوستاد زمانہ شاعر یگانہ اور اوسکے لڑکے کا یہ حال کہ کوئی نہیں جانتا۔ ایسے ہم خیال دوستو ہائے کوئی ہمدرد بھی نہیں جسکے گلے لگ کر اس بے سروسامانی پر چار آنسو بہائیں۔ ان باتوں کو سوچتا ہوں تو بیٹھے بیٹھے دماغ میں جنون کا مادہ پیدا ہوتا ہے خدا گواہ اس وقت آنکھوں میں آنسو موجود ہیں۔ اے تاج تا دان تو ان باتوں کو کیا جانے منہ میرا کب تک دھونیگا جسے تو برا ہی ہوتا ہے لیچ ہے۔ ہمارا ہم خیال آزاد مصنف آبحیات غلط نہ ہوتا کیا ہوتا۔ اوس کے سامنے تو دنیا ہی شاعری کی الٹ گئی) اس دکھ درد کو ہم اہل درد سے پوچھو یا جسے چاہے دل چیر کر دکھاؤ بجز ان تخیلات کے ایک بوند خون نکلے تو

تحقیق تعبیر عرش

اس میں شک نہیں کہ حضرت تسلیم کا رونا سچ ہے مگر پھر بھی جانے شکر ہے کہ منشی تجمل حسین صاحب ایک میرے معزز ہمدرد ہیں دشمنوں سے خدا بچائے مجھے جناب مرشد لاہوری نے ایک بار لاہور سے لکھا کہ آپ کس خیال میں بیٹھے ہیں اسوقت ایک صاحب رامپور سے آئے ہیں اون سے معلوم ہوا کہ آپکے اوستاد لائق شعرا تسلیم بھی لاپتا ہوئے۔ خط دیکھ کر میں فرط حسرت سے نقش دیوار ہو گیا اب نہ تو رہتا ہوں نہ بولتا ہوں۔ بتلائے آفتاب غروب ہو جائے اور اخباری دنیا میں خبر نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد ہوش آیا کہ ہائے ہر چند لکھنؤ اور دہلی میں اور اوستاد موجود ہیں۔ مگر اونکے جوڑ کا کون ہے اب اپنا دیوان کس کو دکھاؤں جن آنکھوں سے کہ ناسخ مرحوم کے دیکھنے والے کو دیکھ چکا ہوں تو اور کس کو دیکھوں۔ بہتر ہے کہ اپنے گلے دیوان کی غرض اس دیوان کو بھی جلا کر دل کی لگی بجھاؤں (سچدان عرش نے ایک دیوان بنارس میں عاشقانہ صاف رنگ کا لکھا تھا ناسخ مرحوم کے کفش برداروں کی صحبت میں وہ کلام ناپسند آیا آخر میں جزو کا دیوان جلا کر بیٹھ رہا) مگر پھر استقلال نے اپنے دامن سے آنسو پوچھ کر کسی قدر اطمینان دیا اور نشان منشی تجمل حسین صاحب کا موجود تھا اونکو خط لکھا۔ میرے مہربان نے بڑی تشفی کے ساتھ ایک عنایت نامہ بھیجکر یہ لکھا کہ یہ خبر محض غلط مشہور ہے۔ اوس کے بعد حضرت اوستاد نے بھی رامپور سے تشفی کی۔ غرض اس کہنہ سال سن رسیدہ کی بابت اکثر ایسی خبریں اوڑی ہیں اور بارہا پورب کے اوڑے شاعروں نے مجھ کو دیکھ کر حیرت کی نظر سے پوچھا ہے کہ کیا اوستاد تسلیم زندہ ہیں۔ اور اس کا خاص سبب ترک سخن ہے

میرے دوستو یہاں اس عبارت سے صرف غرض ہے کہ میں نے منشی تجمل حسین صاحب کی تحریر دیکھی استعداد معقول تھی اور عبارت دلخراش۔ خدا انہیں اگر ذوق سخن عطا کرے تو اپنے والد کا نام روشن کر سکتے ہیں کیونکہ پانی کا ایک

قطرہ کنار صدف میں رہ کر گوہر ہو جاتا ہے۔

اور متعلقین کی مختصر حالت

حضرت تسلیم مدظلہ کے صاحبزادہ منشی تجمل حسین صاحب کی والدہ مدت ہوئی کہ لکھنؤ اپنے وطن سے آئیں اور ہیضہ میں مبتلا ہو کر قضا کر گئیں۔ پھر دوسری شادی وہیں کی منشی تجمل حسین صاحب کی یہ والدہ ابتک رامپور میں تھیں سنہ ۱۷ھ میں قضا کر گئیں ایک دماد اما قدیم وقت کی رہ گئی تھی افسوس وہ بھی ہیضہ میں مبتلا ہو کر راہی عدم ہوئی۔ آخر وقت میں اس نے نمک کا بڑا پاس کیا اور اوستاد کی بہت خدمت کی۔ اب اوستاد کی یہ کیسی پر رونا آتا ہے۔ اور اوسپر یہ بیان آپ مجھے زار زار رولا دیتا ہے کہ بھائی اب میرا زمانہ آخر ہے کہیں نوع دیگر ہو اتو مرا پیچھے میں پتا کون ہے سارے خانہ ویرانی تیرا اڑا ہو۔ ضعیفی کا عالم اور یہی ستم ہے بندہ عرش۔ جو حضرت تسلیم کی غلامی پر فخر کرتے کرتے مر جائیگا حیف چاہتا ہے کہ گیا کو ترک کر کے رامپور چلا جائے۔ اور آخری وقت میں اوستاد کا ساتھ دے۔ مگر اے دکھ درد کے سمجھنے والو۔ متعلقین کو کس پر چھوڑوں۔ اگلی فارغ البالیاں جاتی رہیں گھر تباہ ہوا کئی لاکھ کا قرضدار ہوں یگانہ ہے کہ اب کی فریادت بھی خدا نباہ دے۔ تو جانے شکر ہے۔

حال ملازمت اول

"میرے دوستو۔ آخر مجبوری نے تباہ کر کے ملازمت کا خوگر کر دیا۔ اب بتاؤ ملازمت نہ کرتے کیا کرتے"

محمد علی شاہ بہادر خلد آشیان کے زمانہ میں آپکے والد بہت بیمار ہوئے امید زندگی کی نہ رہی۔ بادشاہ کے حضور ایک عرضی پیش کی مضمون یہ تھا کہ اخانہ زاد بہ سبب پیرانہ سالی و علالت قابل بجالانے خدمت کے نہیں رہا۔ امیدوار کہ میرا لڑکا مسمی محمد امیر اللہ کہ نوجوان اور پڑھا لکھا ہے میری نوکری پر عوضی مقرر ہو جائے)

"اے نئے زمانہ اوس وقت نوکریاں اپنے وارث کے رہتے ہوئے دوسرے کو نہیں دی جاتی تھیں" چنانچہ اوس عرضی پر حکم ہوا کہ (موافق سوال سائل) عمل آرا ہو اور آپ اپنے والد کی جگہ پر اوہدہ دار ہو کر پلٹن میں رہنے لگے تیس روپیہ ماہوار ملنے لگا مدتوں رہے اور اوس زمانہ میں حضرت نسیم دہلوی اور اونکے ہمعصر اوستادوں کی صحبت میں برابر بیٹھنے اوٹھنے۔

اے دوستو یہ اور ہی زمانہ تھا جس وقت کا یہ قصہ ہے اوس کا فوٹو کیونکر کھینچوں۔ یہ گورے چمڑے والے یورپیئن ہی شاید کہیں کہیں ہوں۔ ورنہ شاہی زمانہ تھا ہمارے علم عربی و فارسی کی قدر تھی۔ ابھی تو نئے زمانہ کا ورق کس طرح الٹ دیا۔ میری آنکھیں اوس وقت کی لکھی ہوئی عبارت کو پڑھنا چاہتی ہیں۔

حضرت اوستاد مدظلہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ زمانہ ہے جو میں نے ناسخ اور آتش کو دیکھا۔ اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی حالت فرماتے تھے کہ ٹکسال جو محلہ چوک لکھنؤ میں موجود ہے ناسخ وہیں رہتے تھے۔ صبح و شام پھاٹک پر آ بیٹھتے تھے چند لڑکے نابالغ سے ہنسی دل لگی کر کے لڑکوں کو کچھ سودا کھانے پینے کا دلوا کے اپنے کمرے میں جا بیٹھتے تھے پھر شاگردوں سے یا اور احباب سے صحبت رکھتے تھے۔

اے اوستاد ناسخ۔ آج تم کہاں ہو۔ خدا کے لیے اپنی زیارت سے خواب ہی میں مشرف کرتے۔ تمہارا عاشق کمال عرش خستہ جگر تمہارے دیوان کو دیکھ دیکھ کر روتا ہے ؎

یاد آتے ہیں مجھے حضرت ناسخ جو وزیر
کیا ہی اشکوں کی لگاتی ہے جھڑی میری آنکھ

آتش مرحوم کی حالت اپنی آنکھوں کی دیکھی یہ فرماتے تھے کہ میں نے آتش کو بیت دیکھا ہے جس محلہ میں میں رہتا تھا اوسی محلہ میں وہ تھے انکے بیٹے محمد علی جوش سے بھی ملاقات تھی اوس وقت میں آتش کی یہ وضع تھی داڑھی خلال سے رنگین اور ڈھیلے ڈالے انگرکھے پہنتے تھے۔ اون سے اور اون کے

ملکۂ تاصدن محبت سے ملاقات تھی کیا کہوں وہ کیا زمانہ تھا

"اے زمانہ تو نے مارا ڈالا - اے زندگی پر اکڑنے والو حال رونے کا ہے"

پوچھو سرے بس جائے وہ - ابھی رومال نچوڑ دیگا تو طوفان ہوگا صفحۂ ہستی

کی کیسی بولتی ہوئی تصویریں نظروں سے پنہاں ہوگئیں - خدایا وہ زمانہ

لوگ کیا ہوئے - ان واقعات کو سنکر جی چاہتا ہے - کہ کسی ایسے مقام

سنسان میں چل کر رہیے جہاں بقول استاد ع

ذرہ و اختر زمین و آسماں کوئی نہ ہو

یہ وہی دنیا ہے یا دوسری ہے اون حالات کا سننے والا ہوں - اوسپر

آنکھوں میں آنسو ہیں - میرے دوست حضرت تسلیم کے دل سے پوچھو خدا

جانے کیا حال ہوگا - اسوقت ہندوستان کے مشہور و معروف مستند

اوستادوں میں یہی ایک باقی ہیں جو اپنی آنکھوں سے بہری محفل کو

ناسخ و آتش کے درہم برہم ہو جاتے ہوئے دیکھ چکے ہیں صبح ہوگئی ہے

سینکڑوں شمعیں جل کر بجھ چکیں یہی ایک شمع آخر ہے جس سے یہ نشان

ملتا ہے کہ رات ایک محفل تھی اور وہی محفل تھی - اب کیٹیوں کے جلسے

رہ گئے ہیں - حضرت اوستاد کا ایک مطلع یاد آتا ہے معلوم ہوتا ہے

کہ پرانی شاعری اور آجکل کے شعرا کی حالت دیکھ کر بزم سخن میں سخت گھبرا

گئے ہیں اور فرماتے ہیں کہ -

کیجئے ایسا جہاں پیدا جہاں کوئی نہ ہو

ذرہ و اختر زمین و آسماں کوئی نہ ہو

اور گھبرانے کا سبب بھی مقطع میں موجود ہے - سنئے

تو ہی بتا کیا کریں تسلیم ایسی بزم میں جسمیں سب اوستاد ہوں اور نکتہ داں کوئی نہ ہو

دوستو میرا شوق ہمیں اسوقت ایک ایسی بزم میں لے جاتا ہے

جہاں نئی شاعری اور چوپاچاٹی کے مضامین کے شوق رکھنے والے

کرنے والے بیٹھے ہیں - گرسنے قریب ایک شمع ہے

ہی ہے۔ اور یہاں بہاں پر ایک بیاض قدیم بھی ہے۔ وہ بھی دل
صد چاک کی طرح مختصر ہو گئی ہے۔ ہاں اس میں ایک مثال ہے وہ سنا
تنظیم صورت الفاظ خموشی سخن آرائی ہے
بے زبانی تو میری ہے وہی گویائی ہے
اے سبحان اللہ کیا کہنا۔ رشک کی آگ میں جلنے والوں اس شمع کی تمنا
سمجھ گئے نا۔

واجد علی شاہ بہادر غفرانمآب کے وقت میں ایک خاص وجہ
سے آپ عہدہ (داشتداری) سے برطرف ہو گئے۔ تین برس تک
شب و روز بجز شاعری بیکاری میں اور کوئی شغل نہ رہا۔ اپنی بحالی
کے لئے بہت کوشش کی مگر کارگر نہ ہوئی۔ آخر متوکل ہو کر بیٹھ رہے۔
خدا نے بعد تکلیف پھر راحت دی۔ محل توکل میں پھل آئے اس کا
مزا چکھ کر اب دربار شاہی میں آئے ہیں۔

دربار شاہی اور حال ملازمت بار دوم

نئے جنٹلمین۔ یہاں سبز محل میں منڈی ہوئی کرسیاں اور بلور کا
میز اور لیمپ نظر نہیں آتا میری آنکھوں سے دیکھو قاقم و سنجاب
و قالین کا فرش ہے۔ فرشی جھاڑ اور کنول روشن ہیں۔ ایک طرف
تخت شاہی ہے۔ حضیر بادشاہ جلوہ افروز ہیں اور فرش پر بڑے
بڑے ذی علم اور اہران فن بیٹھے ہیں۔ محمد رضا خاں برق لکھنوی
شاگرد رشید شیخ ناسخ اوستاد سلطان کو دیکھو اک بیاض کی فرزان
پر نظر اصلاح ماشیہ چڑھا رہے ہیں۔ شعر شاعری یا عیش و
عشرت کا تذکرہ ہے۔ ہر وقت کے ماہر فالج الیا نظر آرہے ہیں
سو برم میں امانت وغیرہ بھی ہیں۔ بھلا یہ صحبت آپ حضرات کو کیونکر
پسند آئے گی۔

اس بادشاہ اقلیم سخن کا یعنے اوستاد تسلیم کا قدردان اور ہمعصر بھی کوئی
کے اور کون ہوتا جب واجد علی شاہ خلد آشیان کا فیض عام مشہور جہان
ہوا اور اہل کمال کا مجمع ہوا تو اوستاد ہی کہ اقلیم نظم کے بادشاہ تھے
بوساطت جناب کپتان مقبول الدولہ احسان الملک میرزا مہندی علی خان
بہادر ثابت جنگ قبول تخلص شاگرد رشید شیخ ناسخ کہ اوستاد کے
بڑے دوست تھے۔ اپنے قدردان یعنی واجد علی شاہ تک پہنچے اور
رانکی ضرورتوں سے مجبور ہوکر اپنے استحقاق سوزوں کرکے اور خوشخط
لکھ کے ایک عرضی پیش کی۔

اس سے فارسی کی استعداد ظاہر ہوتی ہے۔ میرے نوجوان
دوستو۔ قبول کو جانتے ہو۔ بڑے ماہر فن اور بڑی عزت شخص تھے
اوستاد اُن کے ملنے والوں میں ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ امیر مرحوم
اور داغ کم عمر اور زیر تعلیم ہوں گے۔ کیونکہ ان دونوں اہل کمال
کے خطوط اور بیان نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اوستاد تسلیم مدظلہ کے شاعری
کی عمر ہم لوگوں کی عمر سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ بتاؤ میں انکی صحبتوں میں
ہمعصری کے خیال سے ایسے کہنہ سال کو زبردستی کیونکر بٹھا دوں
زمانہ پانے سے کیا ہوتا ہے۔

عرضداشت آنحضرت ابوالمنصور ناصر الدین سکندر جاہ فیض زمان محمد واجد علی شاہ خلد اللہ ملکہ

بعرض شہنشاہ عالی مکان
ہنرمند و ہم قدردان ہنر
شان و بشوکت بعز و بجاہ
ز خستہ کسلیم شوریدہ سر
بہ لطف و کرم ساعتے ہوشدار
از دست گردوں بجاں آمدم

فلک آستان و ملک پاسبان
چو خاقان و قیصر بہ گیتی سمر
جہاں تا قیامت چو خورشید و ماہ
ز دل می کشد نالہ نم اثر
بافسانۂ من دمے گوشدار
ز بیچارگی در فغاں آمدم

بسی کز بخت برطل گذشت
که آسان بعش هم چو گل گذشت

چهل گر دولت دین تو بود
جهان تیر نقش هم نگین تو بود

ملک ظلبه را بعد عز و شان
همی خواند بر منبر آسمان

بهمراه مهدی علی خان قبول
سرا بود اعزاز خدمت حصول

هم از خوشنویسی هم از شاعری
توی داشتم چهار چاکری

نقش مثل نکهت برآورده
گذشتی نه بی خنده چون گل دمی

حیاتم به عیش و طرب می گذشت
به آرام و دل روز و شب میگذشت

که ناگاه این چرخ نامهربان
دگرگونه شد در پی امتحان

حسد برد بر عیش و آرام من
بنک ریخت در بادهٔ جام من

رضا را تبع کرد بر ملک و مال
فتاد اختر لکهنو در وبال

نه آن باده ماند و نه آن جام ماند
گر شکوهٔ بخت ناکام ماند

چه ارباب جوهر چه ارباب جاه
به یکبار گشتند جمله تباه

بسی جادهٔ پیمای غربت شدند
بسی زاویه گیر تربت شدند

من از تیرهٔ بختی چو دود و فغان
نه در خاک رفتم نه بر آسمان

چو نقش قدم خاک بر سر بدام
به بیچارگی می کنم صبح و شام

فلک را به این ضعف تاب و توان
هنوز است با من سر امتحان

کنون بر سرم آنکه جفای رود
که از یاد بر نقش پای رود

بسی بر دم اندیشه با جان خویش
کزین شهر بیرون کنم رخت خویش

بدرگاه آن شاه گردون وقار
کشم انتقام از غم روزگار

بجای الم شادمانی کنم
به پیرانه سر نوجوانی کنم

بیام چو غنچه بخود از نشاط
با فسردگی کم کنم ارتباط

نویسم قصیده بصد عز و جاه
بخوانم حضور شه هم کلاه

به شیرین دگر تاب سنبل دهم
بگوش گل آواز بلبل دهم

ولیکن چه سازم که بیمائیگی
رسیده است اکنون بدان پایگی

که در رشک هشکل گوهر نماند
بزردی او صورت زر نماند

نہیں است بس در زمان و مکان | کہ دارم وفائے تو ورد زباں
بود پائے پرکار تا در سفر | بود نقطہ تا محور مرکز سفر
نمودے تو بادا بگردش مدام | محبت تو دارد با رام کام

نمکخوار سرکار عالی جناب
جگر خستہ تسلیم خانہ خراب

جناب سحر لہرانی کی باتیں نہیں بھولتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عرضی میں جو کچھ اپنی بے سروسامانیوں کو تباہیوں اور جہاں دیدہ ہونے کا حال افسوس کے پیرایہ میں لکھا ہے وہ کچھ اس طرح ادا کیا ہے کہ مجھے سعدی کی فصاحت یاد آتی ہے۔ جناب سحر نے حضرت تسلیم کے فارسی نظم پر مجھے بھی کہا کہ زبان اردو تو انکی زبان ہی ہے فارسی میں بھی وہ اوستاد ہیں۔ سعدی نے جو تھکی حالت لکھی ہے وہ یہی رنگ ہے۔ جسکو میرے ناظرین دیکھ رہے ہیں گویا نخل فکر کی خوشنما پتوں پر ہلکا دھانی رنگ ہے اور وہ صفائی ہے اور اس میں گلاب کے دو چار پھول ہیں۔ وہ رنگینی ہے۔ ہاہا کیا خوشنما درخت ہے آنکھوں میں تراوت آگئی۔

اس عرضی کے ساتھ ہی ایک قصیدہ بھی نذر کیا تھا چنانچہ وہ اہل نظر کے ملاحظہ کے لئے درج کرتا ہوں۔

خاقانی اور عرفی کے کلام کا مزہ آتا ہے۔ بعض موقعوں پر صنعت غلو نے قصیدہ کو ستارے سے زیادہ روشن اور بلند کر دیا ہے۔ دوربین کی ضرورت نہیں نیک لگی ہوئی آنکھیں کافی ہیں ع

حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را

قصیدہ

کسطرح نہ دل تڑپے رگ جاں کے برابر | ہر دم ہے دم خنجر بتاں کے برابر
ناکامی قسمت ہے مجھکو تہ گردوں | ہر روز تمنا شب ہجراں کے برابر
تدبیر سحر شام کو ہوتی ہے دگرگوں | کیا کیا ہیں کرم گردش دوراں کے برابر
ادم یہی تدبیر ہے تقدیر سے ایسی | جسطرح پشیماں ہو پشیماں کے برابر

روتا ہوں یہ قسمت کو کہ رہتا ہے ہمیشہ
گردابِ بلا میں گرِ یہ گرداں کے برابر

آرام میسر نہیں دم بھر نہ گردوں
چکر ہے مجھے گردشِ دوراں کے برابر

ٹھہرے سرِ گشتہ یعنی کہ شب و روز
برباد ہوں میں گردِ بیاباں کے برابر

کیا کیا نہیں خونِ گشتہ تمنا میں جگر میں
سینہ ہے میرا کنجِ شہیداں کے برابر

آنسو بھی خفا ہیں جو خفا بخت ہے مجھ سے
ٹک جاتے ہیں آکر مژۂ مژگاں کے برابر

دشوار ہے جنبش صفتِ نقشِ کفِ پا
گھر ضعف سے ہے گوشۂ زنداں کے برابر

کچھ منہ کو چھپائے ہوئے جاتی ہے عدم کو
امید میری عمرِ گریزاں کے برابر

عالم پہ میرے داغ ہو گلزار میں جاکر
بٹتے ہیں جو بھی میں گلِ خنداں کے برابر

تی ہیں دم بہر دلِ مایوس سے میرے
حسرت ہے مجھے داغِ عزیزاں کے برابر

دودِ جگری سے نظر آتا ہے جہاں تار
ہے صبحِ وطن شامِ غریباں کے برابر

پروانہ نہیں سوزِ جگر کی نہ عدو کو
جلتا ہوں چراغِ شبِ حرماں کے برابر

ناقدری دوراں سے نہیں تاب کے قابل
ہر چند کہ ہوں ناظمِ سرداں کے برابر

لیکن مجھے ایں ہمہ بہ وقت ہے تسکیں
ہر مشکل دشوار ہے آساں کے برابر

کہتا ہوں کوئی غم نہیں حامی ہے اگر شاہ
جم مرتبہ شوکت میں سلیماں کے برابر

واجد علی آفاق من کامل صفت ماہ
ہیں مثلِ جہاں بہر درخشاں کے برابر

تا حشر میرا حوصلہ مجھ سے رہے بیزار
دارا کو جو سمجھوں بھی دربان کے برابر

قوت وہ عاجز ہو اگر اسکی حمایت
روباہ بھی ہو شیرِ نیستاں کے برابر

دانش میں فراست میں فلاطوں ہو کہ بقراط
دونوں ہیں یہاں طفلِ دبستاں کے برابر

کسطرح بیاں ہو کفِ ہمتا کا فسانہ
عالم میں گہر ریز ہے نیساں کے برابر

افلاس کا لیتا نہیں دنیا میں کوئی نام
مفلس ہے غنی قیصر و خاقاں کے برابر

احسان و کرم میں کرم و فیض سے اسکی
ہر مور کو دعوی ہے سلیماں کے برابر

حالِ غربا پر یہ ترحم ہے کہ جیسے
بیکس ہو کوئی رحمتِ یزداں کے برابر

دلشاد رعایا ہے یہاں تک کہ شب و روز
رہتی ہیں دعائیں لبِ خنداں کے برابر

[illegible] ہے [illegible]
چمکتی نہ کبھی خرمنِ دہقاں کے برابر

عالم میں بہادر کوئی ایسا نہیں آیا
دیکھی ہیں ورق دفترِ دوراں کے برابر

قوت میں شجاعت میں فن تیغ زنی میں
ہر رستم سے فزوں سام و نریماں کے برابر

لیجیے صف اعدا میں جو ہنگام وغا تیغ
دریا ہو روان خون کا طوفاں کے برابر

حاسد کو اگر چاہیے گرفتار جراحت
تن پر سر ہو سپر پیکاں کے برابر

کیا رتبہ شہ کت ہے کہ پایا نہ عظمت
خنفور نہ پہنچے کبھی دریاں کے برابر

کیا خاک لکھوں قصر علی کی میں تعریف
رفعت میں ہر اک ذرہ ہے کیواں کے برابر

جمل ازل سے جو اڑے روز ابد تک
پہنچے نہ کبھی قبۂ ایواں کے برابر

ہر نقش بر رنگ گل تر و تازہ و رنگیں
ہر صحن مکاں گلشن رضواں کے برابر

کیوں فکر تو ہے فخر ہو تقدیر پہ اپنی
ثابت ہے کہ میں تیغ ہوں حسان کے برابر

کر دیتے شب و روز دل و جان و جگر سے
وقاف شہ قبلہ ایماں کے برابر

یہ بھی وہ رتبہ ہے کہ پڑھتا ہوں قصیدہ
سلطان اولی الامر جہاناں کے برابر

کیا حسن خداداد ہے دیکھے تو عجب سے
کلمہ پڑھے ہر گبر مسلماں کے برابر

جب دیکھی پیشانی و رخسار ہیں روشن
دن رات سہ و مہر درخشاں کے برابر

انساں وہی کیوں نہ کریں حلقہ بگوشی
فرماں ہے تو قیع سلیماں کے برابر

خطبے میں پڑھا جائے اگر نام نہ اس کا
اسلام بھی ہو کیش کشیشاں کے برابر

تسلیم کہا غلط ہوس مدح سرائی
مانا کہ رواں طبع ہے عماں کے برابر

ہنگام دعا ہاتھ سے دیتا نہیں پایا
کہہ جا کے در حضرت یزداں کے برابر

جب تک مہ و خورشید امی رہیں سیار
بے نقش قدم عالم امکاں کے برابر

جب تک جگر شمع فروزاں ہے الٰہی
داغ دل پروانہ سوزاں کے برابر

احباب شہنشاہ کی خاطر ہو جہاں میں
ہر شام رخ صبح درخشاں کے برابر

حاسد کو دکھائے فلک دشمن آرام
ہر صبح سیہ شام غریباں کے برابر

دن بھر رہے پروانے کی مانند پریشاں
راتوں کو جلے شمع شبستاں کے برابر

واجد علی شاہ بہادر نے اس عرضی پر اور قصیدے کے صلے میں بہت کچھ انعام عطا فرما کر عزت کے ساتھ رخصت کیا۔ اور عرضی سابق الذکر پر خاص اپنے قلم سے لکھا۔

بفرمائے خوشنویس والے خوشگو ہر دو فن میلنی و ہر دو نکو
اسم تو مندرج دفتر شد بست و دو روپیہ مقرر شد

غرض وہی تیس روپیہ ماہوار جو پلٹن میں ملتے تھے اب سلطنت جیب خاص بادشاہ سے تا انتزاع سلطنت آپکو ملتے رہے تنخواہ لانے کے لئے آپکو جانا بھی نہیں پڑتا تھا۔ گھر بیٹھے آپکے بڑے بھائی منشی عبد اللطیف صاحب مرحوم کہ ملازم منشی خانہ شاہی میں تھے پہنچا دیتے تھے۔ چنانچہ عرصہ تک آپ نے آرام سے زندگی بسر کی۔ مگر زمانہ غدر کا جب سامان بند ہوا تو آپ پھر اوشدار مقرر کر دئے گئے اور کام انجام دیکر تیس روپیہ ماہوار خزانہ شاہی سے لیتے رہے۔

غدر کا اثر

ہائے لکھنؤ۔ قصر میں جنکے ہزاروں جھاڑ دکھ جلتے تھے انکی قبر پر بھی اب جلتا نہیں شب بھر چراغ قائم و سجاب اور محل کے فرش پر بیٹھنے والے پاؤں پھیلائے خاک میں رو رہے ہیں۔ انکے وہ بڑے بڑے محل جہاں اہل علم و اہل ہنر بیٹھتے تھے آج وہاں ابابیل نظر آتے ہیں جن کے در پر ہاتھی کھڑے ہوتے تھے وہاں کتے بھونکتے ہیں۔ وہ بیگمات و مخدرات عظمت سمات جنکے جسم میں چادر گل گڑتی تھی۔ آج اندھیری تنگ قبر میں سخت زمین پر پڑی ہیں۔ میرے احباب نے یہ مصلح سنا ہوگا کہ

برمزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

وہ باغ جہاں سوائے پھول پھل کے کہیں سبزہ بیگانہ تک نہ تھا آج کانٹے سے بھی زیادہ خشک ہے۔ ہر طرف خاک اڑ رہی ہے۔ سلطنت لٹ گئی۔ اہل علم دانے دانے کے محتاج ہو گئے۔ دنیا منقلب ہو گئی۔ دوستاد کے متعلقین فیض آباد سے چلے آئے۔ صرف آپکے بڑے بھائی لکھنؤ میں تھے حضرت اسکے بھی رامپور چلے آئے۔ مگر افسوس اس زمانہ میں

نواب کلب علی خاں مرحوم رامپور ولی عہد تھے نوکری کرنی پڑی

حال ملازمت بار سوم

نیرنگ دنیا کو دیکھ کر تارک دنیا ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ جس چمن کو فصل بہار میں شگفتہ پایا۔ جہاں گلاب اور ہر طرح کے پھول کھلے تھے۔ خزاں میں اُسے دیکھ کر بے اختیار رونا پڑا۔ نہ وہ پھول نہ وہ پھل نہ وہ قمری نہ وہ بلبل۔ جس محفل میں شام کو ساقی اور ستار مئی اور دلدار یار غمگسار بیٹھتے تھے اُسی صبح کو دیکھا تو گورستان کا عالم یاد آگیا۔ نہ وہ لوگ نہ وہ باتیں مختصر یہ کہ ہر شے میں انقلاب ہے العالم متغیر وکل متغیر حادث۔ انسان کی ہستی کو دیکھے کبھی ایک بچہ تھا۔ کبھی جوان تھا کبھی پیر ناتوان تھا۔ اے نواب خاک میں جا کر سو رہا چاروں تو عزیز و اقربا قبر پر شمع بھی جلا گئے اب ان کا بھی پتا نہیں خدا جانے انکو کس کی نظر کھا گئی۔ لوح مزار بھی نہیں جو یہ ظاہر ہو کہ یہ فلاں شخص کی قبر ہے افسوس۔

زمانہ غدر میں حضرت اوستاد مدظلہ بھی نہایت پریشان رہے۔ رامپور میں طیب علیخاں بہادر سے ملے اور قصیدہ نذر کیا۔ سلام کرنے کو یار جاتے رہے مگر وہ اس وقت میں ولی عہد تھے قلیل و کثیر کچھ مقرر نہ ہوا آخر زمانہ کے آشوب میں اوقات بسری کا یہ ذریعہ ہاتھ آیا کہ ایک جگہ لڑکے پڑھانے کی نوکری کی۔ تیس روپیہ ماہوار اور کھانا ملتا تھا۔ دس بارہ مہینے اسی نوکری میں سینہ کٹے یہ وہ زمانہ تھا کہ بڑے بڑے ذی دول اور اہل کمال خدمتگاری تلاش کرتے تھے در نہیں ملتی تھی۔ شہزادے بھیک مانگتے تھے اور محروم رہ جاتے تھے۔ دس دس گیارہ مہینے تک ڈاک اور رستے کا انتظام چونکہ صاف نہ تھا اس لئے حضرت تسلیم مدظلہ تڑپ تڑپ کر رہتے تھے اب دوات تھا اپنے لوگوں سے چھوڑ دیا تھا کسی کی کسی کو خبر نہ تھی کہ کون زندہ ہے کون کہاں ہے اوسی زمانہ میں آپ کا قلمی دیوان بھی ہمراہ اثاثہ کے لٹ گیا زمانے یہ اوسی لکھنؤ کا ذکر ہے جس پر شیخ ناسخ نے یوں فخر کیا

ہی کوچہ آسمان کی کیا ہے طاقت جو چھوڑا تجھے لکھنو۔ لکھنو ہم پر فدا ہے ہم
فدائے لکھنو) آخر تھوڑے دنوں کے بعد رستہ صاف ہو گیا تو آپ پھر
نواب کلب علیخاں بہادر سے ملے اور کہا کہ گھر والوں کا حال معلوم نہیں
دس گیارہ مہینے ہو گئے اب کوئی خطرہ باقی نہیں سرکار انگریزی نے
بخوبی انتظام کر لیا رستہ بالکل صاف ہو گیا۔ میں لکھنو جاتا ہوں (یہاں سے
یہاں پہلے اختیار ایک مطلع مولوی اولاد علی کا ہش مرحوم جونپوری
مقیم گیا تلمیذ رشید مصنف و اوستاد برادر آتش مرحوم کا یاد آیا۔
میرے دوستو یہ ایک بڑا باکمال اوستاد گذرا ہے اپنا بہت کچھ
نام چھوڑا مگر اہل گیا لے کہ مذاق سخن سے بے بہرہ تھے اور وہ زمانہ
غدر کا تھا انکے کلام کی حفاظت اور قدر نہ کی۔ اور آج بھی بفضلہ یہاں
کے حضرات اس ماہر فن کے کلام کو کوئی چیز ہی نہیں سمجھتے۔ یہ تقاضائے
انصاف ہے۔ ہاں وہ مطلع سن لو)

قفس میں جو تڑپا چمن یاد آیا ۔ مصیبت زدوں کو وطن یاد آیا
نواب صاحب نے فرمایا کہ ہاں اب کوئی خطرہ نہیں ہے بہتر کل ہم
سے ملئے۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے نواب صاحب نے کہ دیا
تھے سو روپیہ زاد راہ دیکر رخصت کیا۔ آپ فرخ آباد اور کانپور ہوتے
ہوئے لکھنو تشریف لائے اپنے بڑے بھائی منشی عبد اللطیف
صاحب مرحوم سے ملے۔ وہ بہت گریہ وزاری سے گلے لپٹ کر
روتے رہے۔ اور آپکا بیان ہے کہ دو چار جوڑے کپڑے کے عمدہ
بنوا دئے اور پچاس روپیہ نقد دیکر وطن قدیم جہاں آپکی والدہ تھیں
یعنے فیض آباد روانہ کیا خدا ہر بچھڑے ہوں کو جگانوں سے تو نہیں ملاتے
اوستاد کا بیان ہے کہ اس وقت میرے پاس دو سو روپیہ تھے والدہ
زندہ تھیں مجھکو دیکھ کر نہایت درجہ خوش ہوئیں (ہائے ماں کی محبت
عجیب محبت ہے) اور جانا کہ گویا مردہ قبر سے اٹھ کر آیا ہے۔ آج
رت جگا ہوتا ہے کل شہید کی قبر پر چادر چڑھتی ہے۔ عزیز و قریب جوار

کے دیکھنے کو آنے لگے غرض یہ کہ دو مہینے میں وہ سب روپیہ اپنی والدہ کے یوں ہی صرف کر ڈالے۔

جب نوکری کی ضرورت پیش آئی تو آپ لکھنؤ تشریف لائے ہر چند وہ لکھنؤ نہ تھا مگر پھر بھی زمین کی تاثیر باقی تھی ہر چند ہوا نامناسب تھی مگر وہاں کی زمین اپنی قوت سے وہ خوش رنگ پھول کھلایا کرتی ہے کہ خواہ مخواہ اہل نظر اوسی طرف سیر کرنے تھے۔ اور اوس وقت میں چونکہ اگلے نوابوں کے یادگار کچھ موجود تھے اس لئے دہلی کے اہل کمال بھی چلے ہی آتے تھے۔ مرحوم ولی خدا تجھے جوار رحمت میں جگہ دے۔ افسوس وہ عالی نسب لوگ بھی بے جان عورتوں کی طرح دل کا حوصلہ آنکھوں سے دیکھ کر نکال لیتے تھے اب تو ویسے صورتیں بہت ڈھونڈھنے سے نظر آتی ہیں۔ ہائے غالب

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

حال ملازمت بار چہارم

یہ وہ زمانہ ہے کہ لکھنؤ میں منشی نول کشور نے اپنا نیا چھاپہ خانہ کیا تھا۔ چنانچہ جب آپ لکھنؤ تشریف لائے خوشنویسی نے ہمدردی کی اوسی مطبع میں بیس روپیہ ماہوار کے منشی مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ نواب محمد تقی خاں بہادر خلد آشیان کہ سات سو ستاون روپیہ ماہوار کے وثیقہ دار تھے اور حضرت نسیم دہلوی کے شاگرد تھے بعد انتقال حضرت نسیم کے آپ کی شاگردی کا فخر حاصل کیا وہ آپ کے بڑے سرپرست اور قدردان تھے۔ حضرت تسلیم مدظلہ کا بیان ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں راہ پیمودہ آتا نواب محمد تقی خاں بہادر بھی تو بہت کچھ سلوک اچھے اوستاد یعنی حضرت تسلیم کے ساتھ کرتے تھے مگر ظاہر طور پر آپکو دس روپیہ ماہوار بھی دیتے تھے مرحوم الموت میں نواب صاحب نے کہا کہ ملئے میں بیس روپیہ ماہوار اپنے وثیقے سے آپکے نام لکھ دوں۔ میرے بعد میرے وثیقہ آپ کو ملے

نہیں کہے۔ مگر چونکہ یہ کلمہ عالم یاس میں نواب نے کہا تھا۔ حضرت تسلیم نے
بہت سے گوارا نہ کیا۔ اور اوستاد نے فرمایا کہ خداوند نہ کرے کہ حضور ہوں
اور میں وظیفہ کی تنخواہ کہاؤں ایسے اہل شاگرد اب چراغ آفتاب لیکر بھی کوئی
ڈھونڈھے ہے تو مل نہیں سکتے۔

اے سبحان اللہ۔ اگلے بزرگوں کے خیالات کسقدر پاکیزہ اور صاف
تھے۔ یا تھے وہ لوگ کیا ہوئے۔ پہلا آج کوئی رئیس کسی کو کچھ عطا کرنے کو کہے
تو وہ بغیر عدالت رجسٹری تک پہنچائے کب مان سکتا ہے۔

حق تو یوں ہے کہ ان رہے سہے چند گنے سال لوگوں کے بعد دنیا میں ایسی
باتوں کا ذکر ہی نہ ہوگا۔

اوسی زمانہ میں آخر انقلاب نے وہ دن دکھایا کہ ۱۲۸۲ھ میں پہلے حضرت
نسیم دہلوی راہی ملک بقا ہوئے۔ اور حضرت اوستاد نے یہ تاریخ وفات کہی

کیا کہوں سوختہ خانی تسلیم — داغ ہے سوز نہانی ہے ہے
اوٹھ گئے گلشن فانی سے نسیم — رشک قدسی و فغانی ہے ہے
ہر طرف سے ہی آتی ہے صدا — موجد شعلہ بیانی ہے ہے
منہ سے نکلی دم شیون تاریخ — ماتم ملک معانی ہے ہے

۱۲۸۲ھ

اس کے بعد حضرت تسلیم مدظلہ نے اپنے اوستاد نسیم دہلوی کا کلام بلاغت
نظام کہ بے نظیر ہے مرتب فرمایا اور نواب محمد تقی خاں کی مسرت سنی اور سعادت
سے وہ دیوان ۱۲۲۵ھ میں چھپوایا۔ اسکے بعد آں قدح بشکست وآں
ساقی نماند۔ خود نواب صاحب راہی ملک بقا ہوئے۔ اور اوستاد کو
شمع ساں روتا ہوا چھوڑ گئے۔ اب جو اہل کمال رہ گئے تھے انہیں اپنے کلام
کے چھپوانے کا اور ترک سخن کا خیال پیدا ہوا کیونکہ اپنا یادگار چھوڑنا ضرور تھا
اوس وقت میں اہل علم و ماہران فن کے بڑے قدردان منشی نول کشور صاحب
موجود تھے انہوں نے حضرت اوستاد مدظلہ کا کلیات اپنے مطبع میں ۱۲۸۹ھ
میں چھاپا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اوستاد حال میں آپ کے ہمعصر جناب آغا علی شمس

اور میرزا غلام محمد خاں تپش وغیرہ موجود تھے۔ جناب شمس اوستاد سے بڑی دوستی تھی۔ چنانچہ زہرہ و مشتری کے نام کا ایک سفارشی خط حضرت اوستاد مدظلہ کا نوشتہ انکے کلیات میں موجود ہے۔ یہ دونوں لکھنؤ کی نامی طوائف اور شاعرہ ہیں شمس مرحوم کے شاگرد ہیں۔ اوس زمانہ میں ان لوگوں میں کچھ شکر رنجی تھی۔

نواب محمد تقی خاں بہادر کے مشاعرے اور قابل افسوس باتیں

میرے ایک روشناس نے میر کلو عرش کی بیجا تعریفیں بہت کیں جس سے حق تو یوں ہے کہ کان بے مزہ ہو گئے مجھے شبہ ہوا۔ اور حضرت اوستاد سے پوچھا کہ آپ نے میر کلو عرش کو دیکھا ہے اوستاد نے جو کچھ فرمایا وہ بعینہ لکھتا ہوں (میر کلو عرش اپنے کو میر کا بیٹا کہتے تھے واللہ اعلم کبھی مشاعرے میں طرح کی غزل پڑھتے نہیں دیکھا۔ میرے شاگرد نواب محمد تقی خاں بہادر کے مکان پر مدتوں مشاعرے ہوتے۔ میر کلو عرش بھی آتے تھے میں نے انکو اپنے زمانہ کہولیت میں دیکھا تھا۔ گذر چکے تھے افیون چڑھ گئی تھی اور افلاس اُنپر طرہ تھا۔ بڑھاپے مشاعرہ کے وقت نواب صاحب کچھ نقدی سے خدمت کرتے تھے اور بس (طرح کی غزل پڑھتے نہیں دیکھا) اس کا مطلب میرے روشناس یادگار میر سمجھے گئے ہونگے۔

مصنف آبحیات کی تحریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ چراغ کے نیچے اندھیرے کا مصداق تھا۔ حیرت ہے کہ شاد لکھنوی مرحوم انکے شاگرد کیونکر تھے۔

اوستاد مدظلہ فرماتے ہیں کہ آتش مرحوم کے مرنے کے بعد لکھنؤ میں یہی ایک جگہ تھی جہاں اہل کمال برابر تشریف لایا کرتے تھے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نواب محمد تقی خاں صحبت یافتہ رئیس اور زمرہ اہل کمال میں داخل تھے۔ انکا کلام دیکھنے ہی کے قابل ہوگا

حضرت اوج فرماتے ہیں کہ میرے اوستاد کے یادگار شاگرد اول جناب منشی اشرف علی صاحب اشرف لکھنوی ایک عرصہ پہلے سے اشرف آباد میں موجود ہیں۔ اوستاد نے انکا نام اپنے دیوان میں بڑا ہی ناز فرمایا ہے اور اکثر صفحہ از اسماء سے ظاہر ہے کہ اس بندہ خدا نے کبھی تنہیں کیا بیٹھے بیٹھے پڑھے ہیں اگر انکا کلام جمع کیا جائے تو دو تین دیوان ہوں۔ حقیر عرش کو خوشی ہے انکے حسن سے وہ ایک عالم نزاکت ظہور کرتا ہے۔ اشرف لکھنوی

روح نکلی تن سے جب بیکل ہوئی یوں شب فرقت کی مشکل حل ہوئی
دیکھی حسرت رہی دل میں میرے تیغ ابرو سے نظر گھائل ہوئی

لکھنؤ کے معزز شاعر کبیر امیر لکھنوی کے مجھ سے ملاقات میں فرمایا تھا کہ جناب اشرف لکھنوی بھی اوستاد مستند ہیں۔ آپکی تصنیف سے مصطلحات زبان اردو یعنی اردو محاورات کا جامع نسخہ ایک نادر کتاب ہے۔ اور نسخہ کے اعتبار سے لاجواب ہے۔ اوستاد کے سینکڑوں شعر اس میں سند کے لحاظ سے داخل کئے گئے ہیں

غرض نسیم دہلوی کی یادگار حضرت تسلیم لکھنوی اور اشرف لکھنوی فخر ہندوستان مشہور و معروف اوستادوں میں باقی ہیں خدا سلامت رکھے افسوس کہ حضرت نسیم دہلوی کی سوانح عمری کسی کے کامل طور پر نہیں لکھی دیکھنے کے قابل ہوتی کیونکہ نواب اصغر علیخاں نسیم دہلوی کا پایہ بہت بلند ہے۔ اور انہیں کے وقت میں شاعری کا باغ شاداب اور تازہ تھا۔

اوستاد نے عالم یاس میں فرمایا تھا کہ حضرت نسیم و مومن دونوں کے لڑکے تھے مگر اب مجھکو نہیں معلوم کہ زندہ ہیں یا نہیں۔ نسیم دہلوی کا ایک لڑکا محمد اسمٰعیل نام عرف بڑے مرزا اپنی بہن کو لیکر حج کو گیا سو وہ واپس نہیں آیا۔ ہائے کیسے کیسے لوگ نام و نشان رکھ کر بھی بے نشان ہو گئے۔ افسوس کہ نواب محمد تقی خان بہادر چل بسے اور نسیم دہلوی کے سلسلے کا مشاعرہ اپنے ساتھ لیکے گئے گویا

شمع کے گل ہوتے ہی پروانے راہی ہو گئے دفعتاً گیا تھا میان انجمن کیا ہو گیا

حال ملازمت پانزدہم

جب لکھنؤ میں میرا قدردان اہل کمال نواب رامپور اور کلب علیخان بہادر والی رامپور مسند نشین ہوئے شعر و شاعری کا چرچا ہوا۔ تو انہوں نے حضرت استاد مرحوم کو لکھنؤ سے بلا کر شاعروں میں تین روپیہ ماہوار پر نوکر رکھا حضوری میں رہنے لگے یہ وہ زمانہ تھا کہ قلق۔ امیر۔ تحر۔ منیر وغیرہ موجود تھے۔ دو برس کے بعد عدالت فوجداری میں ناظر کیا۔ پھر پیشکار کیا بعد اونکے آپ محکمہ صدر میں ناظر ہوئے پچاس روپیہ ملنے لگے۔ پھر مدرس فارسی ہوئے۔ پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے۔ اب سرکار رامپور سے بطور پنشن وہ ماہوار ملتے ہیں۔ گو کچھ کام کرنا نہیں پڑتا ہے مگر اسلئے سرکار کی اور کتب خانہ میں حاضری ضرور ہے۔ لکھنؤ کی آمد و رفت بوجہ صاحبزادہ منشی تکمل حسین صاحب اور احباب کے ابتک برابر جاری ہے۔ مشاعرے کی شرکت امیر۔ منیر وغیرہ کے بعد امیر و داغ و جلال کے وقت میں بکثرت ہوئی کبھی امراء سے تشریف لے بھی جاتے تھے۔ تو لوگوں کی فرمائش سنکر پڑھتے تھے کبھی کچھ شعر پڑھ دیتے تھے مگر گویا ترک سخن کر چکے ہیں دریا کی آمد و رفت بھی قید جا بند ہے عید وغیرہ میں بھی قصیدہ لیکر نہیں جاتے فہرست نذر میں آپکا نام ہوتا ہے صرف دستخط کر دیتے ہیں اور بات یہ ہے کہ نواب حامد علیخان بہادر خلد اللہ ملکہ والی رامپور کو وہ شوق سخن نہیں والی منگرول آپکے بہت بڑے قدردان ہیں (والی منگرول نے ایک زمانہ میں اہل کمال کی بہت قدردانی شروع کی۔ ہر چند خود شاعر نہیں ہیں مگر پھر بھی ادھر ادھر کے شعرا نے آمد و رفت شروع کی قصیدہ پر قصیدہ گذرنے لگا تھے کہ خزانہ نے ریاست کو قرضدار کر دیا۔ اب چیدہ لوگوں کی آمد و رفت باقی ہیں حضرت شمشاد لکھنوی کے بھی یہ بیت بڑے قدردان ہیں اور اکثر یاد فرماتے ہیں) ایکبرس آپ منگرول بھی تشریف لے گئے تھے وہاں جاکر جو آپ نے بھیجے سرفراز نامہ بھیجا تھا وہ یہ ہے۔

"نواب صاحب بہادر کا یہ نظر تدبر والی و عرشہ لقرائی یہ چاہتا ہے کہ
ذلیل یہیں رہے پچاس روپیہ ماہوار اور جو خرچ کہ ہوگا دونگا۔ کسی طرح کی
تکلیف نہ ہوگی میں نے ہاں نہیں کچھ نہیں کہا۔ اور نہ میرا ارادہ ہے کہ یہاں
رہوں۔ لوگ کیا کہیں گے میرے دوستو آپ نے اسکا مطلب سمجھا۔
یعنے رامپور والوں کا یہ طعن ہوگا کہ آخر وقت میں انہوں نے ریاست کا
کچھ خیال نہ کیا اور پچیس روپیہ کو کم جانا) دوسرے یہاں کی آب و ہوا
بھی بسبب نزدیک ہونے سمندر کے بہت خراب ہے۔ اور خلقت
غیر مانوس نہ میں اونکی زبان سمجھتا ہوں نہ وہ میری۔

واقعی ان حالتوں میں آپ کس طرح تشریف رکھتے نمک کا خیال کیا
اور اوسی پنشن کو غنیمت جانکر واپس آئے۔ مگر بطور پنشن ریاست منگرول
سے بھی کچھ ضرور ملتا ہے کیونکہ ایک بار کہا تھا کہ میری چودہ مہینے کی تنخواہ
چاہئے نہ اونہوں نے عنایت فرمائی نہ میں نے طلب کی اور بسبب نمک
سخن کے کوئی قصیدہ بھی نہیں بھیجا والئی منگرول کے میر منشی محمد اصغر خانصاحب
صاحب رامپور کے رہنے والے ہیں ابھی آئے تھے ہمسے ملے تھے میں
نے اون سے بھی اپنی تنخواہ کی بابت کچھ ذکر نہیں کیا۔ پندرہ روپیہ ماہوار
اس ریاست سے بھی ملتے ہیں۔

حال عمر

آپکی عمر الہم زدہ قریب سو برس کے ہے۔ آپ نے خود بھی ارشاد
فرمایا اور ظاہر بھی یہی ہوتا ہے نوے سال سے آپکی عمر متجاوز ہے۔

آخری سفر

جب رامپور میں چند لوگوں کی برطرفی کی خبر مشہور ہوئی۔ تو پہلے امیر
لکھنوی نے رامپور چھوڑا بھوپال ہوتے ہوئے فکر معاش میں دکن گئے۔
اور وہاں کی خاک پر پاؤں پھیلا کے سو رہے۔ اس پر ارمان کی ناکامی

پہلی حضرت [illegible] ہے [illegible] ہے یہاں [illegible]
[illegible] (کچھ یہ مقام شاعروں میں داغ ہی کے لئے مبارک ہوا کیونکہ
اُنکی قدر دانی ایسی کی گئی جو انکے اوستاد ذوق مرحوم کی بھی نہیں ہوئی
ہر چند وہ دلی کی گلیوں پر دکن کو صدقہ کرتے تھے۔ مگر وہی دکن اسوقت
اس مرحوم کے نام کو شاگرد کے نام سے تمام عالم میں روشن کر رہا ہے۔ بلکہ
نصیر دہلوی اوستاد ذوق مرحوم بھی یہیں کو شہ گیر ہیں۔ پھر حضرت اوستاد
نے قدم استقلال کو جنبش دی سیدھے ٹونک گئے وہاں آپکے ایک
بڑے سعادتمند شاگرد وزیر محمد خاں صاحب آپکے قدر دان تھے۔ جب آپ
وہاں پہنچے معلوم ہوا کہ وہ تو کل فقط کر گئے۔ اب کہاں جاتے بنگر دل
ہوتے ہوئے رامپور چلے آئے۔ نواب کو خدا نے فرزند ارجمند عطا کیا تھا
اس خوشی میں برطرفی رہ گئی آپ بھی رہ گئے۔ ہر چند کہ امیر کے انتقال
کے بعد آپکے معترف احباب نے آپکو دکن کی طرف جانے کی راستے دی مگر
آپ نہ گئے بلکہ حال کی الحال۔ چمن کچھ اور کہتی ہے۔ وطن کچھ اور کہتی ہے
والی طرح میں آپ نے ایک آہ سرد کھینچکر یہ مطلع پڑھا کہ
میرے دل میں تمنائے دکن کچھ اور کہتی ہے۔ مگر یاد امیر بے وطن کچھ اور کہتی ہے
اس سے صبر و قناعت کی بو آتی ہے۔

شاگردوں کا مختصر حال

یہ وہ معاملہ ہے جسکے بارہ میں زبان قلم کی طاقت سے قدرتاً زائل ہوئی جاتی
ہے میں نے چند قلمہ عریضے بھیجے مگر حضرت اوستاد نے برابر یہی کہا کہ
شاگردی اوستادی کیسی شاعران نو دکن کا دلال ہوں (مگر ہاں اصرار جو
اکثر لوگوں کا نام آپ نے فرمایا۔ یا لکھ بھیجا ہے۔ اونکا نام نامی درج تذکرہ کرتا
ہوں اور اونکے بارہ میں منصفانہ رائے بھی ظاہر کرتا ہوں)
مرحوم نوروز علی خاں شہید الکھنوی۔ اوستاد نے انکا نام جن تعریفوں
کے مستحق ہونے کے لائق لکھا وہ مجھے انکی حالتوں کے لکھنے کو مجبور کرتا ہے

یہ ہے کہ یہ ہر طرح ہماری بزم سخن کا [illegible] تھا اور خزانہ
ہے اسکو خشک کر دیا ایک زمانہ میں اخبار ملکی ہند بیہر ہٹ اور اودھ پنچ سے
بھی کچھ کمی تھی باہم جو جو لکھتے تھے یہ ملکی ہند کا چشمہ اور طرز دار تھا۔
بہت کچھ نثر لکھا اور چاہا کہ اوستاد اسپر اصلاح دیں۔ مگر وہ رسے
پورا لے لوگوں کے خیالات چونکہ منشی سجاد حسین مہتمم اودھ پنچ اور اوستاد
کی ملاقات تھی اس لئے اوستاد نے مجبوری ظاہر کی اگلیات منیر لکھنوی
میں جہاں امیر و داغ تک کی تاریخیں اور امیر وغیرہ کی بطور تقریظ نظمیں
موجود ہیں وہاں اس باکمال کی بھی تقریظ ہے اور جن لفظوں میں انکا نام
منیر مرحوم نے لکھا ہے اوس سے انکی حالت ظاہر ہو سکتی ہے۔ معلوم
نہیں دیوان انکا چھپا ہے یا نہیں۔

منشی سید احمد وفا رامپوری۔ جناب وفا کا کلام ایسا پاکیزہ اور اوستاد
کے رنگ میں ہے کہ مجھے انکا نام دوسرے شہر میں لکھنا ہی پڑا کیونکہ شہر
صحبت میں برابر رہے ہیں۔ اوستاد کے کلام کا سایہ پڑ گیا ہے شرف
حضوری اسقدر کسی کو نصیب ہے۔ وفا کے پاس دو چار دیہات سرکاری
بطور مستاجری کے ہیں اور کہنڈسار جس میں شکر بنتی ہے یہ بھی ہے دس
پانچ آدمی نوکر ہیں۔ وفا کی وفاداری کی جو کچھ تعریف کروں بجا ہے اوستاد
گذشتہ سال میں عارضہ ہیضہ میں مبتلا ہوئے۔ رامپور میں کوئی نہ تھا
یہ اپنے مکان پر اوٹھا لے آئے اور بہت خدمت کی خدا کے فضل سے
اچھے ہو گئے پھر بھی اوستاد کو جدا کرنا گوارا نہ کیا اپنے مکان میں رکھکر
مطابق رہت خورد و نوش کا سامان کرنا چاہا مگر اوستاد کو کب یہ منظور تھا آپ
نے فرمایا کہ باوجود تاکید غیرت نہیں قبول کرتی کہ دوسرے کی
روٹی پر پڑوں چنانچہ کچھ نقد لے پا گیا وہ مجبوری لے لیتے ہیں۔ خدا
ایسے اوستاد پرست کو ترقی دے۔

منشی اعزاز الدین صاحب اعزاز مہتمم گلدستہ خدیجہ حامدی۔
آپ نعت گو ہیں کلام سنجیدہ ہے۔ انکی اور حقیر کی غزلیں استاد کی نظر سے اکثر

بھی ہوئی صحت ہی پہ یادگار ہیں۔

سید عطا کریم صاحب۔ عطا۔ بہاری۔ آپ بہت مضمون رس ہیں۔ میرا انکا ساتھ گیا کے دو ایک مشاعروں میں ہوا ہے۔ خصوصی مشاعروں میں نہیں ہے۔ کم و بیش ہمیشہ کچھ کہہ لیتے ہیں۔ اوستاد نے اکثر تذکرہ آپکی غزلوں کے اصلاح کا مجھ سے کیا ہے۔ بڑے صاف باطن شخص ہیں۔

مولوی ظہیر احسن شوق نیموی آپ کا نام اخباری دنیا میں تحقیق اور جلال اور آزاد سے جھگڑنے کے باعث روشن تھا مگر اب انہوں نے لو یا ترک سخن کیا صاحب دیوان ہیں۔ مجھ سے ملاقات بھی ہے۔ اور مشاعرہ میں میرا انکا ساتھ رہا ہے۔ اب داغ کی تقلید کرتے ہیں صاف شاعری آپکو پسند ہے۔ ذی علم ہیں۔ حضرت اوستاذی الناظم شمشاد فرنگی محلی لکھنوی کے بھی شاگرد ہیں زیادہ تر لوگ انہیں شمشادی کا شاگرد جانتے ہیں۔ عظیم آباد میں طبابت کرتے ہیں۔

مولوی نظیر حسین فریاد۔ آپ بھی صاحب دیوان ہیں کلام عاشقانہ ہے۔ طبیب ہیں۔ آپ صوبہ بہار میں تشریف رکھتے ہیں۔

انکے علاوہ منشی گور پرشاد قیس اور بہتیرے لوگ ہیں جنکا نام معلوم نہیں۔ مدراس اور رامپور میں سینکڑوں شاگرد ہیں۔ کیا کروں میں نے تو چند بار اوستاد سے پوچھا آپ نے بتایا نہیں۔ ایک بار اوستاد نے سرفراز نامہ میں لکھا تھا کہ میں اس قابل نہیں ہوں جو کسی کو اپنا شاگرد کہوں آپ لوگوں کی شرافت ہے جو مجھے اپنا اوستاد فرماتے ہیں۔ کیا کہوں کبھی کبھی کے کہنے والے مشاعرے کے شوقین بہتیرے ہیں ویسی ہی انکی غزل بھی دیکھ دیتا ہوں کبھی مجھے یہ بھی نہیں پوچھتے کہ تصرف کیوں کیا لکھنؤ میں جو لوگ تھے مر گئے۔ اب امیر مرحوم کے اکثر شاگردوں نے اور رامپور کے اکثر نومشقوں نے دق کر رکھا ہے۔ ترک سخن نہ کروں تو بتائے کیا کروں۔ اس آپکے اطراف میں سید عطا کریم عطا اور نظیر حسین صاحب فریاد بہار میں رہتے ہیں

اور پٹنہ میں مشتاق ہیں۔ اور کیا میں بحر مہتاب سے اور کون ہے۔

اور یہاں میں بھول گیا۔ ایک بار آپ نے برابر والوں میں سید جعفر علی قادر کا نام لیا تھا کہ یہ بھی مجھے اپنا کلام دکھاتے تھے اب دیوانی فکر کے باعث ترک سخن کیا کہ اکثر حضرات نے میری مسافت سے اور استاد کے پاس اصلاح کی درخواست کی آپنے صاف لکھا کہ اور لوگ موجود ہیں۔ اے ذوق کسکو چشم حقارت سے دیکھئے۔ سب ہم سے ہیں غزلوں کا کوئی ہم سے کم نہیں۔

اخباری دنیا میں بسر کرنے والا عرش بھی اپنے کو پانچوں سواروں میں داخل کر کے بلو بیادگار صفحہ دہر کچھ اپنا حال رقم کرتا ہے کہ پیمدان کو شاگردی پر فخر نہیں صرف غلامی پر مدت سے فخر ہے۔ صاحب دیوان ہوں مگر کلام ناپسند طبع ہے۔ عربی فارسی کی کتابیں عالم باعمل مولانا محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ اور مولوی عبد الکریم صاحب سے پڑھی ہیں مگر وہ کچھ نہیں۔ چند کتابیں اپنی تصنیف سے بعض قرض میں ہیں مگر وہ کپڑوں کے نذر کے لئے الماری میں بند کر دیں کیا کروں فصل نکل گئی۔ مضمون کے شعر پسند کرتا ہوں مگر نئی روشنی والے بگڑتے ہیں۔ سو پشت سے تعلقداری بھی ہے۔ مگر والد مرحوم یعنی جناب منشی بندہ علی صاحب وکیل و رئیس شہر گیا منصور کے وقت کا تین چار لاکھ روپیہ خرچ ہو گیا و صاف پاک ہے۔ اوستاد کے آخری وقت میں اونکی شہرت کو مرتا ہوں۔ اوسپر بھی کوئی اوستاد بھائی ساتھ نہیں دیتا اپنی مشق کے بارہ میں کیا لکھوں عمر گذر گئی مگر ہنوز نرا دل ہے۔ سب شاگردوں میں خدا نے مجھی کو بدنام کنندہ و نام نیکو یافتہ ہے۔ دلی میں پیدا ہوا حتی المقدور رسا تلامذہ کی صحبتوں میں رہ کر زبان کی درستی کی کوشش کی۔ مگر آب و دانہ نے زیادہ گیا ہی میں رکھا اور اسیکو وطن مشہور کر دیا۔ اوسپر اہل وطن نے کچھ اس طرح دل بڑھایا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ لکھنؤ۔ دہلی۔ بنارس و غیرہ کی بہت سیر کی مگر ہنوز جی نہیں بھرا۔ جسطرح اوستاد فرماتے ہیں کہ ؎ اور میں جنکو ہے اے نسیم شاگردی پہ ناز

میں کلیم دہلوی کے کفش برداروں میں ہوں

اوسی طرح پیمدان بھی اپنی شاگردی پر فخر کرتے کرتے مر گیا

وہ سلوا ب [illegible] ہے کہ گستاخیکر
ہو کر ہی رہتا خوب ہیں مدعم تا یاد کی سیر کرنا بہتر تھا۔ بقول غالب
بنا کر فقیر ہم ایک کہ زمین کے تلے کہ تیتے ہیں سب اہل سخن زمین کے تلے
مصرعے کی شرکت ہیں ان سے جو شوخی کیا کرو ن غزلیں کہنے کے قابل کہ
شعور نہیں۔

فیض خواب

تذکرہ یادگار صنم میں صنم سلمہ لکھتے ہیں کہ حضرت تسلیم مدظلہ نے نسیم دہلوی کو
خواب میں دیکھا کہ وہ بہ نظر اصلاح ایک شعر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یوں
نہیں یوں کہو۔ اس بارہ میں میں نے اوستاد سے پوچھا آپکا بیان ہے کہ یہ
خواب نہ تو میں نے دیکھا نہ کسی نے کہا معلوم نہیں صنم کو کیونکر معلوم ہوا ہاں
اوستاد البتہ یہ فرماتے تھے کہ میں نے مومن خاں اوستاد نسیم دہلوی کو تو نہیں
دیکھا مگر خواب میں دیکھا اور یہ وہ زمانہ تھا کہ میں مثنوی صبح خنداں کہہ رہا تھا
دیکھا کہ چراغ جل رہا ہے اور میں ایک مقام کو پڑھ رہا ہوں کہ مومن خاں صاحب
تشریف لائے اور پوچھا کہ مطلب سے اتنقدر بعد۔ پھر آنکھیں کھل گئیں
میں نے اوس مقام پر چند شعر بڑھا دیئے اور باقی سب نکال ڈالے۔ ہائے
خدا جانے اوستاد نے یہ کس عالم میں فرمایا۔ کہ

اسد کہاں تسلیم اگلی شاعری مرمٹے وہ لوگ تجھ پر جلنے لئے

بعض تئی روشنی والے واللہ اعلم میری ان باتوں کو کیا سمجھ رہے ہونگے
کیونکہ وہ نیچرل شاعر ہیں اور اصلاح کے خلاف رہنے والوں میں ہیں اونکا
دعویٰ ہے۔ شاگرد کسیکا نہ کسیکا اوستاد۔ انہیں خواب و خیال کی باتوں
پر کیا وثوق آسکتا ہے جنہیں اعجاز ہی پر شبہ ہے۔ لو انکے سامنے ایک شعر
پڑھ کر الگ ہو جاتا ہوں۔ سن لیں۔

من کہ باشم عقل کل را ناوک اعجاز ادب
مرغ اوصاف تو از اوج بیاں انداختہ

مزے مزے کی باتیں

ہائے دل نہیں مانتا کیا کروں۔ عرش

باغباں الفت گیسو مجھے لے آتی ہے عشق پیچاں ہے تیرے باغ کی دیوار پر

ناظرین میری آنکھوں سے دیکھیں اس محفل میں چند جہاں دیدہ بلند پروازی کی بال کی کھال کھینچ رہے ہیں۔ بعض اکڑ کر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں بعض نوعروس کی طرح سنگار کرتے بے اختیار درد و غم بھلا کر ہنسا رہے ہیں۔ اللہ اللہ کیا فارغ البالیاں ہیں خدایا وہ کیسے لوگ تھے کیا اوسوقت بھی یہی دنیا تھی۔ آج تو اون تذکروں کے سننے والے مجھے جھوٹھا سمجھ رہے ہیں۔ اون کو کیا کروں۔

حضرت اوستاد ارشاد فرماتے ہیں کہ بلند پروازی کا زمانہ گذر گیا اب تاویل اور استعارہ وغیرہ کوئی چیز نہیں لوگ پرانی لکیر کا فقیر جانکر داد دیتے ہیں عذر مجہول پیش کرتے ہیں کہتے ہیں کہ شاعری ہے کہ مجذوب کی بڑ۔ ہاں رشک مرحوم کے وقت میں یہ ہوا چلی تھی۔ شعرا تمسخر کرنے لگے۔ اور یہ رنگ پسند نہیں کیا۔ منیر مرحوم اور قابل وغیرہ نے اسکو برتا ایک مشاعرے میں قابل نے پڑھا کہ

ع چہرا چلا فلک پہ نہ جنگ کا چھوٹا ہے بیل گاؤ پہ کتا تفنگ کا

(اہل نظر نے بھری ہوئی بندوقیں بہت دیکھی ہونگی اس چہرے کو دیکھیں اور چیز ہے۔ ایک چہرا پتھر کے دل میں سوراخ کر ڈالے) اب منیر مرحوم فرماتے ہیں کہ

ع پیٹھ پر تیرے پڑیں کوڑے کی چھڑیاں تو سہی۔ انکا ایک دیوان ہی اسی رنگ میں ہے (اوستاد ناسخ کی تعلیم کا اثر ہے چھڑی نہیں بھولی) اب رشک مرحوم کہ مستند اوستادوں اور ناسخ کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ کہتے ہیں کہ ؎

چاول الماس گوشت لخت جگر فرقت یار میں پولاؤ نہیں

غرض ادہر یاران طریقت اہل مشاعرہ کے لئے خیالی پلاؤ ہی پکا رہے تھے کہ ایک نازک بدن بیگم صاحبہ آگئیں۔ لیجئے انکی خاطر کیجئے مگر یہ تو کچھ اپنے ساتھ گھر سے بطور تحفہ لیتی آئی ہیں۔ ناظرین نے انکو پہچانا۔ لیجئے چہرے

سے گھونگٹ اوٹھتا ہے صاف صاف دیکھ لیجئے۔ اے لاحول ولا قوۃ ہیں
کس خیال میں تھا۔ یہ تو جان صاحب ریختی گو ہیں۔ اے لیجئے انکا دعویٰ ہے کہ
استعارہ کی بال کی کھال جو یہ لوگ کھینچ کر مشاعرہ میں چھوڑ گئے ہیں اوسکی کھال
کھینچوں گا۔ آپ کہتے ہیں کہ ؎

اب بدلے شاعری کے فقط رہ گئی جگت ۔ ایجان پہنوا نگر کہا ہاتھی کے تھان کا
ہو ہو ہو۔ اس انگرکھے کے آگے منیر مرحوم کا وہ کورتا کیا مال ہے غرض یہ سینکڑوں
شعر مہمل کہہ کے جناب رشک کیطرف کہ اوسوقت وہ اوستاد تھے منسوب
کرنے لگے۔ اوسی پلاؤ نہیں والی طرح میں ایک مطلع کہا کہ

دور سے چھیڑے ہلاؤ نہیں رشک۔ بیٹھا ہے بن بلاؤ نہیں
اے سبحان اللہ کیا کہنا۔ مردہ قصابوں کی روح قبر میں بے اختیار پھڑک گئی
ناظرین اب آپ ہی بتائیں جہاں آج ہجو پر ہجو ہو وہاں لوگ استعارہ کی
توبہ کرکے گھر چھپ کر نہ بیٹھیں کیا کریں۔ اوستاد نے ان تماشوں کو بھی طرح
اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایسے ایسے سینکڑوں قصے ہیں جنکو طوالت
کے باعث نہیں لکھ سکتا۔ کوئی ان حالتوں کو اوستاد کے دل سے پوچھے۔
ہمچدان بھی پہلے ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلتا رہا اور استعارہ وغیرہ سے
دلچسپی رکھتا تھا۔ مگر جب سے یہ حالت سنی جی چھوٹ گیا۔ حق یوں ہے کہ
تغزل کا مزا سعدی اہلی وغیرہ تک ہو گیا

ایک مطلع اوستاد کا یاد آیا ہے۔ اس سے رشک کے پھولوں کی خوشبو
آتی ہے۔ اوس زمانہ کی روش ہی یہی تھی۔

بلبلیں آمادۂ فریاد ہیں گلزار میں حشر برپا ہو رہا ہے کوچہ و بازار میں
مگر۔ مزے میں دودھ اور شربت کا فرق ہے۔ وہاں یہ صفائی اور
لطافت نہیں۔ اہل زبان زبان پر رکھ کر مزا چکھ لیں یہ چیز اور ہے
اور اس میں خداداد تاثیر بہت ہے۔

سرسری محاکمہ

پیچیدان عرش جو کسی طرح کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس اہم کام میں کس طرح ہاتھ لگائے۔ اور کیا فائدہ کہ خواہ مخواہ دیدہ دلیری بھی کرے۔ اور طعن سنے۔ کہ شاگرد نے اوستاد کو سب سے بڑھا دیا۔ ہر چند کہ مصنفین نے محاکمہ کیا ہے مگر اب زمانہ کی حالت اور ہے۔ اسلئے مجبور ہوں مگر چونکہ سوانح عمری میں ایک بات رہ جاتی ہے اسلئے مجبور ہو کر چند فارسی کہنے والوں کی کلام بلاغت نظام سے اوستاد کے شعروں کا محاکمہ کرتا ہے۔ اور اردو کہنے والوں کو چھوڑتا ہے کیونکہ انیسے اور دبیرے فرقہ کیطرح مجھے کسی کی یادگار سے الجھنا نہیں آتا۔

قصیدہ۔ آپکا خاقانی اور عرفی کے رنگ میں ہے اور اگر بہ نظر غور دیکھنے والے دیکھیں گے تو ایک آدھ جگہ بڑھ گیا ہے اب دو ایک باتیں اور ہیں۔

خاتم الشعرا شیخ علی حزین مرحوم جنکا مزار بنارس فاطمان میں ہے۔

کہتے ہیں کہ آہستہ برگ گل بہ فشاں بر مزار ما ٭

بس نازک است شیشہ دل در کنار ما

شیخ علی حزین کے اوستاد ہونے میں کسکو کلام ہو سکتا ہے مگر ناظرین دیکھیں یہاں حزین نے دل کے ضعف اور نازک ہونے کو لکھا ہے جو واقعی بدیہی طور پر بھی نازک ہے اوستاد جسم کی ناتوانی کو لکھتے ہیں کہ بظاہر ہی دل سے ہزار درجہ قوی ہے ہر چند جسم میں وہ بھی مقفل ہے مگر خصوصیت نے فرق ڈال دیا ہے۔ تسلیم

ناتواں وہ ہوں کہ زیر خاک مدفن بعد مرگ ٭ بار ہے سایہ مجھے مژگان چشم مور کا

حق پسند حضرات سمجھ لیں۔

سعدی کہ اپنے رنگ میں یگانہ گذر گیا ہے۔ اوسکا نہ ماننا بدرجہ کفر جانتا ہوں۔ مگر ع۔ بات کہنے کی جو ہوتی ہے کہی جاتی ہے۔ سعدی۔ شہر واسط کی مصیبت کو رو کر خلیج فارس کے بدو جزر کو صرف بڑھاتے ہیں کہتے ہیں کہ

ولما لص و معی فی مصیبت واسطہ تزید علی مد الخلیج والجزر

اوستاد ہجر یار میں رونے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

اوج پر ہے چشم تر کا جوش طوفاں آجکل ۔ اک کف سیلاب ہے گردون گرداں آجکل

ہر چند ہجر اوس مصیبت سے سوا ہے مگر اہل درد اوس مصیبت کو ہجر سے سوا ہی جانتے ہیں یہاں تو وصال کی بھی امید ہے وہاں تو کچھ بھی نہیں شعر احسن بیان اور بلاغت پر نظر ڈالکر موازنہ کرلیں۔

سعدی کا وہ رنگ جو سہل و ممتنع ہے عجیب رنگ ہے۔ اس رنگ میں بڑے بڑے اہل کمال نے سعدی کا خاکہ اوڑایا مگر اولاً تو وہ نقش نہ تھا۔ اور تھا بھی تو رنگ بھرنا باقی تھا۔ سعدی ایک چیز کے مستثنے کرنے کی خوبی کو کیا خوب بیان کرتے ہیں۔

جزوے بجز آہ بوہ زنے ۔ اگر برشدے دودے از روزنے

اوستاد نے اسی رنگ میں مثنوی صبح خنداں میں شکارگاہ کے مقام پر فرمایا ہے کہ

نہ باقی رہا کوئی طایر وہاں
مگر نام کو ایک زاغ کماں

یہاں پر اوستاد سے وہ کام ہوا جو علی حزین سے نہ ہوسکا۔ بہرکیف اس سے میرا مراد یہ نہیں ہے کہ اوستاد ان اساتذہ سے سوا ہیں یا یہ اساتذہ کچھ نہ تھے۔

موجودہ دماغی کیفیتیں

میرے دوستوں نے باغ میں جاکر اکثر کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھا ہوگا۔ ہر پھول اپنی طاقت کے مطابق سرسبزی دکھلا کر کمہلا جاتا ہے۔ نظر بازوں نے تاروں کو دیکھا ہوگا۔ رات بھر اپنی درخشانی پر نازاں ہوکر صبح سویرے چراغ سحر سے بھی زیادہ اوداس نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے سمجھنا چاہیئے کہ انسان کی قوت بھی ضعیفی تک گویا زائل ہوجاتی ہے۔

حضرت اوستاد کی عمر کی بابت میں لکھ چکا ہوں کہ قریب سو

برس کے ہے۔ اور ستر بہتر برس کی مشق ہے۔ یہ اوس باغ کا پھول ہے جس کو انقلاب نے خزاں ہو کر خاک میں ملا دیا۔ مگر اوسکی شان کہ یہ پھول جسکو میرے باغبان قدرت نے ایک موزون گلدستہ بنا کر ہندوستان کی زیبائش کے لئے رکھا ہے ابتک سرسبز ہے کیونکہ میری آنکھوں کے آنسو اسکے لئے شبنم ہیں گرچہ بھی خزاں زمانہ کا اثر اتنا ضرور ہے کہ یہ گلدستہ کبھی کبھی پژمردہ معلوم ہوتا ہے۔

یہاں پر حضرت اوستاد کے ایک سرفراز ناموں کا خلاصہ نقل کرتا ہوں۔

(۱) یعنی مشفقی منشی ضمیر الدین احمد عرش زاد عنایتکم۔ بعد سلام سنت الاسلام کے مظہر ہوا ہوں آپکی غزل دیکھ کر پانچ دن ہوئے کہ روانہ کر چکا اپنی حالت کیا لکھوں نوے برس سے زیادہ عمر ہے نہ وہ بصارت باقی ہے نہ وہ سماعت عینک میں لکھنؤ سے لے آیا تھا سو ہے مگر وہ دوربین نہیں ہے لکھنے میں کام نہیں دیتی اوسپر بھی کتب خانہ سپرد ہے میں اپنا دوسرا دیوان بھی جمع کر رہا ہوں ۲۷ جزو لکھ چکا ہوں اغلب کہ ۳۰ جزو ہو جائیں

رقیمہ نیاز محمد امیر اللہ تسلیم از رام پور

(۲) غزل آپکی دیکھ کر منشی اعزاز الدین کو درج گلدستہ حدیقہ عامدی کے لئے دے دی وہ کہتے ہیں کہ میں پرچہ برابر بھیجتا ہوں۔ واللہ اعلم۔ اور اس طرح میں پر زور غزل کہہ کر بھیجئے ؎

جنت سے بدل جائے جہنم تو مزا ہو

چنانچہ ہمدان نے دوران علالت میں ایک مختصر غزل بھیجی تھی جو گلدستہ مذکور میں درج ہے اوستاد کی اس ذرہ نوازی پر فخر ہے) میں دیکھکر یہاں مالک گلدستہ کو درج کرنے کے لئے بھیجدونگا۔ کیا کروں لوگ خواہ مخواہ دق کرتے ہیں۔ یہاں بھیجنے میں چار مشاعرے ہوتے ہیں جناب امیر لکھنوی کی خاطر سے صرف شرکت بھی ضرور ہے مگر اب شعر و شاعری کیا کروں ہر وقت موت نگاہ میں پھرتی ہے چاہتا ہوں کہ آخر وقت تو خدا کا نام لوں۔

بقول سعدی

اے کہ بیجاہ رفت در خوابی مگر ایں بحر رو در دریابی

۹ ذی الحجہ ۱۳۱۸ھ ہجری رقیمہ نیاز امیر اللہ تسلیم از رامپور

میرے دوستوں پر ان سرفراز ناموں سے پورا حال ظاہر ہوگیا ہوگا۔ ہر چند ضعیف ہیں مگر شوق سخن باقی ہے اور آجتک کلام عیوب سے پاک ہے۔ اور تاریخ گوئی کہ جس سے بڑھکر دماغ سوزی اور طرح کے نظم میں شاعر کے نزدیک نہیں ہے اوس میں بھی ابتک آپکو کمال ہے۔ آپ کی تازہ غزل درج ذیل کی جاتی ہے۔

غزل اوستاد تسلیم

تھک گئے ہم حسرت ذوق شہادت کم نہیں ہمسے دم لیلو اگر تیغ ستم میں دم نہیں

دردمندان ازل رکھتے نہیں درماں کا غم سینہ صد چاک گل منت کش مرہم نہیں

روز مرتے ہیں ہزاروں تیغ ابرو دیکھ کر گر یہی عالم تمہارا ہے تو یہ عالم نہیں

شادی و غم کا نہیں رکھتے بکھیڑا اصفیا دل خانۂ آئینہ میں نغمہ نہیں ماتم نہیں

مر مٹے ہم عشق کے شہرے وہی ہیں آجتک شور رسوائی پس مردن بھی اپنا کم نہیں

نالۂ آتش فشاں بولیں اگر ہیں اوج پر تو نہیں اے آسماں فتنہ گر یا ہم نہیں

بعد مردن خاک ہی بہلیگا کنج گور میں اپنا بیگانہ نہیں مونس نہیں ہمدم نہیں

سیکھ آئے ہو کہاں سے آج یہ بیماریگی تم نہیں وہ یار جانی یا وہ عاشق ہم نہیں

بے ثباتی پر بہار باغ کے روتا ہے چرخ برگ گل پر اشک کے قطرے ہیں شبنم نہیں

بیخودی کا ہوش اکسیر پشیماں آج ہیں آپ آئے آپ میں بدقسمتی سے ہم نہیں

خط کے آجانے سے حسن و عشق رخصت ہوگئے اب لگاوٹ کس لئے وہ تم نہیں وہ ہم نہیں

بیستی ہے بعد مردن گور میں دشمن کیطرح یہ زمیں بھی آسیا رنگے آسماں کم نہیں

پاکدامانی کسی مرکے بھی آتی ہے یاد بے سبب اوگنا لحد پر پنبۂ مرہم نہیں

وقت پیری کیا کریں تسلیم ہم فکر سخن
دل میں وہ قوت نہیں کس بل نہیں دم خم نہیں

کلیات امیر اللہ تسلیم کو چھپے ہوئے سنہ ۱۲۸۹ھ و سنہ ۱۳۱۹ھ کے

سے تیس برس کا زمانہ گذر گیا عمر شریف کے اعتبار سے اوس زمانہ میں آپ ضعیف ہو چکے تھے مگر ذوق جوان تھا خود فرماتے ہیں کہ

پیر ہوں پر ہے جواں ذوق غزل خوانی ہنوز
لطف دیتی ہے مجھے میری سخن دانی ہنوز

رنگ قدیم کو کیا پوچھتے ہو وہ زمانہ ہی مضمون زا مشاعرے کا تھا۔ اس زمانہ جہالت میں کہ فارسی عربی جاننے والے مشکل سے ملتے ہیں اور نا فہم یا انگریزی دانوں کا شمار تاروں سے زیادہ ہے مگر اوستاد مدظلہ کا رنگ نہیں جاتا اور ایسا خوشنما رنگ ہے۔ جیسے کسی حسین کے گورے گالوں کی ذرا سی سرخی کہ خواہ مخواہ دل کو بیقرار کر دیتی ہے۔ زبان پر مضمون کا ہلکا رنگ ایسا موزوں ہے جیسے پلکوں پر آنسو نہ کہ گلاب کے پھول پر پہاڑ۔

میں کچھ اگلا کلام یہاں پر درج کرتا ہوں۔

بھولے سے بھی نہ جانب اغیار دیکھنا
خط وفا یہی ہے خبردار دیکھنا

مانند شمع بیٹھ کے طے کی رہ عدم
یارو یہ معجزہ ہے کہ رفتار دیکھنا

کہتی ہے روح دل سے دم نزع ہو غبار
ہمتو عدم کو جاتے ہیں گھر بار دیکھنا

اللہ رے اضطراب تمنائے دید یار
فرصت میں اک نگاہ کے سو بار دیکھنا

میری خطا نہیں ہے خدایا جو کچھ کہوں
پھر چھیڑتا ہے زاہد مکار دیکھنا

تسلیم روئے یار کو حسرت کی آنکھ سے
اچھا نہیں ہے شوق میں ہر بار دیکھنا

اور کیا کاہیدہ ہوتا لاشہ مجھ کمزور کا
سایہ ہے پائے کفن مژگان چشم مور کا

کہتے کہتے شمع کے مانند آخر جل بجھا
منھ نہ دیکھا میرے لاشے نزد ہان گور کا

سوز غم سے ہوں میں افتادہ سراپا آبلہ
شیر کا ناخن مجھے ناخن ہے پائے مور کا

دیکھنے کے صاف دل جنبی ہیں سب کے فیض ہیں
خانۂ آئینہ میں حصہ نہ دیکھا چور کا

ضعف میں افتادگی زندان سے ہو کم نہیں
طوق ہے گردن میں حلقہ موج آہ مور کا

کوئی صدمہ ہے فلک شکوہ زباں تک آگیا
میں لب تصویر ہوں خوگر نہیں ہوں شور کا

تیرہ دل کو نفع کیا تسلیم شعر صاف سے
دیکھنا بیکار ہے آئینہ چشم کور کا

ے قدیم صحبت کا اثر ہے رشک کا زمانہ تھا

قریب کام بہ وقت پر نہیں آتا
بجھائے دل کی لگی کو جگر نہیں آتا

کہاں گئے جو عیادت پہ جان دیتے تھے
مزار میں کوئی لینے خبر نہیں آتا

حجاب دیدۂ نرگس سے باغ میں نہ کرو
یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا

خیال خام ہے اپنے سے منتفع ہونا
صدف کے کام کسی کو گہر نہیں آتا

اجل خفا ہے فلک مدعی زمیں دشمن
مرا جہان میں کوئی نظر نہیں آتا

ہنسائیں کیا تیری اٹکھیلیاں مجھے کہ ہنوز
تجھے وہ ناز نسیم سحر نہیں آتا

ابھی سے کیا کریں دعوی شاعری تسلیم
یہ کام وہ ہے کہ جو عمر بھر نہیں آتا

ہائے دلی تیری بہولی صورت نہیں بہولتی ؎
پژمردہ ہو گئے گل رخسار ہائے ہائے

دلی تباہ ہو گئی مگر وہ باتیں نہیں بہولتیں۔ اوستاد بھی ہر چند کہ لکھنو کے متوطن ہیں مگر دہلی ہی پر فخر ہے۔ کہتے ہیں ؎ میں ہوں تسلیم شاگرد نسیم دہلوی۔ مجھکو طرز شاعران لکھنو سے کیا غرض۔ یوں تو ہر غزل میں دلی کی بو آتی ہے مگر ایک آدہ غزل اوسی رنگ کی درج بھی کرتا ہوں۔

غزل

میں اہل صفا بھی ہوں تو کیا ہوں
آئینے کی طرح خود نما ہوں

اس بزم جہاں میں صورت شمع
غیروں کے لئے میں جل بجھا ہوں

نکہت ہوں مگر چمن سے چھٹ کر
یہ باد میں صورت صبا ہوں

ہوں آہ دل حزیں جہاں میں
جینے میں کمال نارسا ہوں

میں کیا کہوں لطف سیر عالم
ہوں خواب میں خواب دیکھتا ہوں

حال دل گم شدہ ہوں کہتا
افسانہ طراز آشنا ہوں

کم حوصلہ شوق دل نہیں ہے
ہوں جیسے جسقدر میں چاہوں

کیوں شرط وفا اسی کا ہے نام
تم تو کرو ترک میں بنا ہوں

افسانۂ دوستی ہوں تسلیم
دشمن کا مگر سنا ہوا ہوں

چند جدید تاریخیں حضرت تسلیم کی کہی ہوئی بغرض نمونہ انکشاف حالات دماغ اپنے ناول اور دیوان سے نکال کر درج کی جاتی ہیں یہ سچمدان عرش کو اپنے پر فخر ہے

تاریخ دیوان نظم نگار مصنفہ عرش

زہے اوج فکر فلک سیر عرش — سراپا ہے الہام جس کا سخن
کیا جمع دیوان سحر نظام — ہوا سرمہ چشم اہل زمن
کہن گو نہ بی رنگ اصلاحین — مبرا ہین لفظ و زبان و دہن
کہا فکر تسلیم نے بہر سال — یہ دیوان ہے فخر ارباب فن
۱۳۱۷ھ

ولہ

نہ ہے عرش دیباچہ شیوا بیان — کلامش چو اعجاز فرخ سرشت
کنون داد ترتیب منظوم خویش — جو گلدستہ بزم باغ بہشت
پے سال تسلیم شوریدہ سر — ہمہ خوب و بیمثل دیوان نوشت
۱۳۱۷ھ

تاریخ ناول ثمرہ نافرمانی مصنفہ عرش

یہ افسانہ ایسا لکھا عرش نے — کہ ہر اہل سخن کو محبوب ہے
نہین پوچھتی گفتگو جو مدام — زباندان کے نزدیک معیوب ہے
کہی ہمنے تسلیم تاریخ طبع — یہ بیمثل ناول چھپا خوب ہے
۱۳۱۷ھ

معذرت

مجھے نہایت رنج اور افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ حیات تسلیم کو جس شوق اور دلی خواہش کے ساتھ میں نے اپنے معزز دوست حضرت عرش کو لکھنے کی تکلیف دی تھی۔ چند ایک مجبوریوں کے باعث حسب مدعا اسکو اچھی طرح چھپوا نہ سکا کچھ میری بیماری۔ عدم الفرصتی پرائیویٹ مصروفیت اور سفر اور کچھ کاتب صاحب اور مطبع والونکی مہربانیون نے ہندوستان کے مشہور شاعر حضرت تسلیم اور انکے کثیر التعداد شاگردون اور فن سخنگو کے بیشمار شائقون کو نہایت صدمہ پہونچایا افسوس ہے کہ مین جلدی مین غلطیان بھی ترتیب دیکر دوسرے ایڈیشن مین انشاء اللہ تعالیٰ تمام شکایتین دور کر دیجائینگی اور لکھائی چھپائی نہایت نفیس ہوگی اور اصل بات یہی ہے کہ ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

نیاز مند محمد الدین فوق ایڈیٹر اخبار پنجہ فولاد لاہور